

سلسلہ
مسیحی کتبِ دینیات

دعوتِ نگاہِ نو

ڈاکٹر کینتھ کریگ

مترجم
ڈاکٹر حیات فیروز

دعوتِ نگاہِ نو

ڈاکٹر کینتھ کریگ

مترجم

ڈاکٹر حیات فیروز

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی۔ لاہور

بار اوّل　　۱۹۶۶ء　　تعداد ۱۰۰۰

The publication of this book was assisted by a subsidy from the W. P. C. C. Literature Board and a small grant from the Theological Education fund.

پیش لفظ

دعوتِ نگاہِ نو کینتھ کریگ (KENNETH CRAGG) کی مشہور کتاب "THE CALL OF THE MINARET" کے دسویں باب کا ترجمہ ہے۔ کینتھ کریگ دینِ اسلام کے جیّد عالم ہیں۔ آپ مشہور رسالے "مسلم ورلڈ" کے کئی سال تک مُدیر معاون، امریکن یونیورسٹی آف بیروت میں فلسفہ کے پروفیسر اور ہارٹ فورڈ سیمنری (HART FORD SEMINARY) واقع کنکٹی کٹ میں کئی سال تک عربی اور اسلامیات کے پروفیسر بھی رہے ہیں (THE CALL OF THE MINARET) آپ کے اسلام سے متعلق گہرے اور کئی برسوں کے مُطالعہ کا نتیجہ ہے۔

اسلام اور مسیحیت میں عرصہ دراز سے ایک گہرا رشتہ چلا آرہا ہے۔ دونوں مذاہب مشرقِ وُسطےٰ میں پیدا ہوئے اور دونوں میں بے شمار باتیں مشترک ہیں، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ کئی صدیوں سے دونوں مذاہب

نظریاتی لحاظ سے اکثر برسرِ پیکار چلے آتے ہیں۔ تاریخ اِس بات کی شاہد ہے کہ یہ نظریاتی جنگ کئی دفعہ خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ مُصنّف کا خیال ہے کہ یہ صُورتِ حال باہمی غلط فہمیوں کی وجہ سے ہے، اِس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ مسیحی دُنیا اسلام کو سمجھنے کی پُوری پوری کوشش کرے۔ اگر دونوں مذاہب میں باہمی غلط فہمیاں بدستور قائم رہیں تو یہ نا صرف مسیحیت اور اسلام کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں بلکہ ایک بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہیں۔ "دعوتِ نگاہِ نَو" کو ترجمے کی صورت میں پیش کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ پاکستان کے مسیحی اسلام اور اُس کے بُنیادی نظریات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اِس طرح وُہ مسیحی بنیادی نظریات کو اہلِ اسلام تک بطریقِ احسن پہنچانے کے قابل ہو جائیں گے۔

ہم اُمّید کرتے ہیں کہ "دعوتِ نگاہِ نَو" کا مُطالعہ پاکستان کے مسیحیوں کے لئے دینِ اسلام کے بُنیادی نظریات کو پڑھنے اور سمجھنے کا باعث ہو گا اور اس طرح دونوں مذاہب کے لوگ ایک دُوسرے کے زیادہ قریب آ سکیں گے۔

"حیات فیروز"

فہرست مضامین

ناقابلِ فہم اشکال کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ ترجمے کے فن میں ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ جو کچھ ایک زبان میں مقبول شکل میں پیش کیا گیا ہے، اُسی مفہوم کو دُوسری زبان کی مقبول شکل میں بھی تبدیل کیا جائے۔ لہٰذا کوئی مطلب اپنے مخالف کو اُس وقت تک نہیں سمجھایا جا سکتا جبتک کہ اُسے اُسی کے محاورات میں واضح نہ کیا جائے کیونکہ الفاظ ہی تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہیں۔

اس نکتے کی اہمیت از خُود عیاں ہے اور یہ باتیں ہم پر اس بات کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں کہ نئے عہدنامہ میں خُداوند یسُوع مسیح کو کلام کیوں کہا گیا ہے۔ انگریزی زبان کی انجیل میں بجا طور پر کلام کے لفظ کا پہلا حرف بڑا لکھا گیا ہے۔ مسیحی ایمان کے مطابق جس سے ہم خُداوند یسُوع مسیح کو مانتے اور سمجھتے ہیں، مسیح خُدا کا کلام ہے۔ جو کچھ کہ خُدا ہم سے کہنا چاہتا ہے، خُدا کلام کرنے میں مصروف ہے۔ خُدا نہیں چاہتا کہ انسان اور اُس کے درمیان خاموشی حائل ہو اور اس طرح انسان اور اُس کے درمیان اجنبیت رہے۔ اسلام میں خُدا کا آخری کلام پیغمبرِ اسلام میں سربمہر یا مکمل سمجھا جاتا ہے۔ مسیحیوں کے نزدیک خُدا کا کلام شخصیت ہے جو کہ خُداوند یسُوع مسیح کی شکل میں جسم کی صُورت میں مجسّم ہُوا اور اُس کے اقوال و کوائف، اُسی کے خصائل، تاریخ اور معنی آدمیوں کے لئے بائبل میں محفُوظ ہیں۔ اس طرح بائبل مُقدس یسُوع مسیح سے ایک اخذ شدہ کلام کی حیثیت رکھتی ہے جس میں کلامِ مجسّم کی حقیقت محفُوظ

وملفوظ ہے۔ لہٰذا یسوع مسیح کی زندگی خُدا کو ظاہر کرنے والی اور بائبل مقدس اس زندگی کی تاریخ ہے جس کے بیان کے ذریعے سے ہم حقیقی زندگی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

اس لئے بائبل مُقدّس قرآن سے مُختلف حیثیت رکھتی ہے کیونکہ قرآن میں مکاشفہ، لکھے ہوئے الفاظ کی صُورت میں ملتا ہے اور خُدا ہم پر اپنے آپ کو الفاظ اور کلام کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ مسیحی اور اہلِ اسلام دونو اس بات پر مُتفق ہیں کہ خُدا کا اظہار خُدا ہی سے ہو سکتا ہے۔ جو کُچھ خُدا کہنا چاہتا ہے خواہ وُہ خود کہے خواہ وُہ اپنا کلام انبیا اور اولیا کے ذریعے سے دُوسروں تک کیوں نہ پہنچائے تاہم جو کُچھ انبیا اور اولیا کہنا چاہیں وُہ انسانوں کے نزدیک قابلِ فہم ہو ورنہ اس کلام کے کوئی معنی نہ ہوں گے اور نہ ہی لوگ اس کو سمجھ سکیں گے مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ مکاشفہ کا یقینی ذریعہ ایک شخص ہی ہو سکتا ہے اور مکاشفہ کا یقینی طور پر سمجھنا انسانی زندگی کے ذریعے ہی سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ خُدا کے فضل سے زندگی ظہور پذیر ہُوئی اور اس زندگی میں عظیم الشان کام واقع ہُوئے۔ لہٰذا ہو نہیں سکتا کہ مسیح کو سمجھنے کے بعد خُدا کو نہ سمجھا جا سکے۔ خُداوند مسیح نے خود فرمایا کہ "جس نے مُجھے دیکھا اُس نے خُدا کو دیکھا"۔

چنانچہ خُدا نے اپنی نسبت آدمیوں کو سمجھانے کے لئے انسانی رُوپ کو ضروری سمجھا اور اس مقصد کے لئے اُس نے ان اشیا کا استعمال ضروری سمجھا جو انسان کے استعمال اور علم میں آتی ہیں مثلاً چرنی۔ دیہات میں

بڑھئی کی دوکان، کھیت، عبادت خانہ، گیتسمنی اور اماؤس کی راہ۔ ان تمام اشیا کے استعمال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا خود ہی اپنی تعبیر کرتا ہے اور اس طرح انسانی زندگی کا لبِ لباب الٰہی تشریح کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کلام کو سنتے ہوئے ہم پر خدا کا انکشاف ہوتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا انسان سے کیا چاہتا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ کلام مجسم ہوا۔

لیکن ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ دوسرے کلام کی طرح الٰہی کلام بھی انسان کی بے توجہی اور بے پروائی سے انسانی رسائی سے دور اور شعور سے باہر ہونے کے سبب خاموش اور ناقابلِ شنید ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بعض اوقات جو کچھ خدا کہتا ہے وہ بے توجہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ بات متعدد بار یا کئی بار تمام بنی نوع انسان پر صادق آتی ہے۔ الٰہی کلام کے سمجھنے کے لئے ایک دیکھنے والے کی شہادت ضروری ہوتی ہے۔ ہمیں مسیح میں خدا کی محبت کو سمجھنے کے لئے الفاظ کا تحفظ کرنا ہے۔ ہم پر فرض عاید ہوتا ہے کہ ہم خدا کی تشریح جو اس نے اپنی ذات کی نسبت خود مسیح کے ذریعے کی ہے اس کو لوگوں کے ذہن میں اتاریں۔ متی رسول کی انجیل میں یہ آیت آتی ہے کہ تو اس کا نام عمانوئیل رکھنا جس کا ترجمہ ہے "خدا ہمارے ساتھ" اس موقعہ پر لفظ عمانوئیل کا ترجمہ ایک ضروری شرط ہے۔ یہ اگر ہو تو سب کچھ ہے اور اگر نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ یہ وہ محور ہے جس کے گرد "عمانوئیل" گھومتا ہے کیونکہ "خدا ہمارے ساتھ ہے"۔ یہ صرف ایک لفظی بیان ہی نہیں بلکہ ایک عقیدے کا اظہار بھی ہے۔ یہ محض لفظی اعلان نہیں بلکہ ایک تجربہ

ہے اور جب تک اس کی طرف توجہ نہ دی جائے اس کی نسبت سوچ بچار نہ کی جائے، اس کو مانا نہ جائے تو اس کا ظہور عبث ہے، اگر معنی سمجھے نہ جائیں تو معنی بیکار ہیں۔

دُنیا میں مسیحی تبلیغ کی حیران کُن حقیقت کا پس منظر اسی کلام کی تشریح کا کام کرتا ہے۔ ہمارا فرض دُوسروں تک یہ کلام پہنچانا ہے اور اس کلام کا لوگوں کی زبان، محاورے اور ذہن کے مطابق ترجمہ کرنا ہے۔ ہمارے الفاظ کو اسی کلام کا پابند ہونا ہے اور ہماری زندگیاں اُس کی زندگی کی پابند اور ہماری شخصیتیں اُس کی ذات کی پابند۔ اُس کی نسبت لوگوں کو ہمارے ذریعے پتہ لگ سکتا ہے کیونکہ لوگوں کو خُدا کا علم لوگوں کی زندگیوں ہی سے مل سکتا ہے۔ پاک کلام میں آیا ہے کہ "تُو مجھ میں اور مَیں اُن میں تاکہ دُنیا جان لے کہ تُو نے مجھے بھیجا ہے" (یوحنا ۱۷ : ۲۳)

زندہ کلام یعنی مسیح کو پیش کرتے وقت ایک مسیحی کو مُشکلات پر قابو پانا سیکھنا لازمی ہے اور ساتھ ہی اِن مُشکلات کے تجربات کو اس بڑے کام کے سرانجام دینے میں استعمال کرنا چاہیئے۔ جس چیز کو سب لوگوں کے لئے قابلِ قبول سمجھا جاتا ہے اس کو سب کے نزدیک قابلِ قبول ہونا بھی چاہیئے۔ مفسّر اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ مسیح میں خُدا کا کلام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے بشرطیکہ وُہ صابر، مُستقل مزاج، حلیم، مدبّر اور رُوح القُدس کی راہنمائی میں کام کرنے والا ہو۔ ہر عقلمند مترجم کی طرح یہ مُفسّر بھی زندگی کے تمام شعبوں سے

مدد لینے کے لئے اُن تک کوشش کرتا رہے گا۔ وُہ ہر مخالفت کے وقت صبر سے کام لے گا، یہ جانتے ہُوئے کہ کوئی مخالفت بغیر تعلّق کے نہیں ہوتی۔ اسلام کا خصوصاً یہ اثر ہے کہ وُہ مسیحی مفسّر کو اس بات پر مجبُور کر دیتا ہے کہ وُہ اپنے ایمان کا اظہار انقلاب انگیز اُور صبر آزما طریقے سے کرے۔ اسلام اپنی پُر زور اُور کڑی تنقید کی وجہ سے مسیحیوں کو مجبُور کرتا ہے کہ وُہ مسیح کو اُور واضح طور پر لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ مسیحیوں کو چاہیئے کہ وُہ ہر غلط فہمی کی تشریح صبر و سکُون کے ساتھ کریں۔ انہیں چاہیئے کہ ہر مُشکل کو اپنی خوش قسمتی تصوّر کرتے ہُوئے اُس سے فائدہ اُٹھائیں۔

تشریح :- شخصی اُور ذاتی تعلّقات کا تقاضا کرتی ہے لیکن خُدا کی بادشاہت کی ترقی یا اس کا دُوسروں تک پھیلنا ایک رُوح سے دُوسری رُوح کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ہم خُدا کی بادشاہت کو قانون کے ذریعے سے دُنیا پر قائم نہیں کر سکتے اُور نہ ہی ہم اپنے بشارت کے فرض کو لوگوں کے ساتھ گہرے تعلّقات قائم کیئے بغیر پُورا کر سکتے ہیں کیونکہ لوگ انجیل کا محوَر ہیں۔ ہم مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر ایک انسان لا انتہا حد تک قدر رکھتا ہے چنانچہ وُہ استعارات جن کے ذریعے سے ہم اپنے کام کی تشریح کرتے ہیں، اُن کا تعلّق چرواہوں، بھیڑوں، گڈریوں اُور لوگوں سے ہے۔ ہمیں لوگوں کے ارادوں اُور ذہنوں کا نازک کام سپُرد کیا گیا ہے۔ لٰہذا کلام جو کہ مسیح ہے ان کی روزمرہ کی لُغت پر مُشتمل ہونا چاہیئے۔ ہم کو ان چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو اُن کے ذہنی تاثرات اُن کے

الفاظ کے زیروبم اور روزمرّہ کی زندگی سے متعلق ہوں۔ ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ہمارا عمر بھر کا کام یہ ہے کہ ہم لوگوں کے ذہنوں میں اُترنے کے لئے راستہ بنائیں۔ ہمیں اُن کے نزدیک اتنا ہونا چاہیئے تاکہ وُہ ہمیں سُن سکیں۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ شاید اُن کی رفاقت اور نزدیکی حاصل کرنا ہے لیکن ہمارا اوّل اعتماد ہمیں اپنے بیان کی اہمیّت پر ہونا چاہیئے اور ہمیں اس کو اس طرح پیش کرنا چاہیئے جیسا کہ اس کو پیش کرنے کا حق ہے۔ پولوس رسُول نے فرمایا کہ "سُننا مسیح کے کلام سے پیدا ہوتا ہے"۔ اگر کوئی چیز لوگوں کے ذہن میں نہ اُترے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو صحیح طور پر پیش نہیں کیا گیا۔ اگر اس نکتہ کو سمجھ لیا جائے تو پھر اسلام کے لئے مسیحی تشریح کن چیزوں پر مشتمل ہونی چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ مندرجہ ذیل پانچ ضروری شعبے ہیں جن کی تشریح کرنی ضروری ہے۔

(۱) مسیحی الہامی کُتب (۲) مسیح خُداوند کی ذات

(۳) مسیح کی صلیب (۴) خُدا کی نسبت مسیحی نظریہ

(۵) مسیحی کلیسیا (مسیحی معاشرہ)

۲۔ الف۔ مسیحی الہامی کتابوں کی تشریح۔ مسیحی تشریح الہامی کتابوں سے شروع کرنے کی دو معقول وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام میں الہامی کتابوں کا احساس موجود ہے اور ان کے نزدیک قرآن سب سے بڑی اور سب سے مکمل الہامی کتاب ہے اور وُہ ہر مذہب سے توقع

کرتا ہے کہ اُس کے پاس الہامی کتاب ہو اور دُوسری وجہ یہ ہے کہ بالآخر مسیح اور خُدا کو پیش کرتے وقت تمام تشریح، بائبل اور خصوصاً نئے عہدنامہ کے بیانات پر مرکوز ہو۔ ہمارا سب سے اہم کام یہ ہے کہ ہم اہلِ اسلام کو اس بات کے لئے تیار کریں کہ وُہ اناجیل اور رسُولوں کے خطوط کا صبروسکُون کے ساتھ مطالعہ کریں۔

لیکن اِن دو معقُول وجُوہات سے دو بڑی مُشکلات بھی پیوستہ ہیں مسیحیت میں الہامی کتابوں کی نوعیت اور کردار، اسلام میں اسلامی کتابوں کی نوعیت اور کردار کے متضاد ہے۔ یہ تضاد محض تھا اور الفاظ کا ہی نہیں، اگرچہ مسیحی عربی زبان اور اسلامی عربی زبان میں نمایاں فرق ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بہت گہرا اجنبیّت ہے جو کہ زبان کے ترجمے کے تمام مسائل کی حدُود سے پرے ہے۔

ایک مُسلمان جب بائبل مُقدّس کا مطالعہ کرتا ہے تو وُہ معلوم کرتا ہے کہ یہ ایک مُختلف کتابوں کا مجمُوعہ ہے، جسے مختلف مصنّفین نے تقریباً ایک ہزار سال کے عرصے میں لکھا۔ نئے عہدنامے میں وہ چار اناجیل اور مُختلف خطُوط پاتا ہے۔ یہ کیفیّت اہلِ اسلام کی متبرک کتاب کے بالکل متضاد ہے، کیونکہ وُہ کتاب صرف ایک ہی شخص کے ذریعے آئی اور وُہ صرف مکّہ اور مدینہ کی تئیس سالوں کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اِن کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ چار انجیلیں کیوں ہیں، جبکہ روایتاً (ان کے خیال میں) انجیل صرف ایک ہی کتاب ہے جو خُدا نے مسیح کو دی۔ وُہ فوراً یہ فرض کر لیتے ہیں کہ

چونکہ انجیلیں چار ہیں اس لئے ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں۔ اس بات کی وضاحت جو عموماً مسلمان کرتے ہیں، وہ اس طرح ہے کہ ابتدائی کلیسیا سے اصلی انجیل جو اسے خداوند یسوع مسیح کی طرف سے ملی تھی، کھو گئی ہے اور بہت سارے مذہبی راہنماؤں نے اس کا تدارک کرنے کے لئے خود انجیل کو لکھنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لہٰذا سب جھوٹی ہیں۔ یہاں سے ایک اور مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انجیل حقیقتاً کیا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک مکاشفہ یا الہام کے معنی یہ ہیں کہ تمام پیغمبر خدا کے کلام کو لے کر آتے ہیں اور یہ کلام مکمل حالت میں اُن کے سپرد کیا جاتا ہے اور یہ آسمان سے اُن تک زبانی پہنچایا جاتا ہے اور اس کلام کا انحصار کسی رُوحانی یا ذہنی قویٰ پر نہیں ہوتا لہٰذا خداوند مسیح کی تعلیم اگر اُسے اچھی طرح سمجھا جائے تو الفاظ کا ایک مجموعہ ہے جو کہ اب کھو گیا ہے لیکن خوش قسمتی سے وہ قرآن شریف میں جو کہ آخری مکاشفہ ہے، محفوظ ہے۔ اس خیال کے مطابق انجیل مسیح کے ذریعے آئی نہ کہ مسیح میں آئی۔ "مسیح میں" کی انجیل سے یہ مراد ہے کہ خدا نے انسان کی نجات کا انتظام آدمیوں کے درمیان رہ کر کیا اور جو چار اناجیل رسُولوں کی معرفت آئیں اُن کے خصائل اور امکان کا انحصار اس عقیدہ (خدا مسیح میں) پر ہے۔ مسیحی نظریہ کے مطابق یہ نہ صرف قرین قیاس ہے بلکہ لازمی بھی ہے کہ اُس کی زندگی اور موت کی اہمیت اس طرح درج کی جائے جس طرح سے کلیسیا کے ذہن متاثر ہوئے تھے۔ چاروں انجیلیں

اختلافات کو رفع کئے بغیر مُتحد ہو کر ایک مرکزی شخصیت کی نشان دہی کرتی ہیں۔ وُہ کلیسیا کے مابین اس لئے اُبھریں تاکہ خُداوند یسُوع مسیح کی نجات بخش یاد کو ہمیشہ قائم رکھ سکیں کیونکہ وقت اُس زمانے کے لوگوں کو اُٹھائے لئے جا رہا تھا اور فلسطین کے باہر کی دُنیا بھی اس رفاقت میں شریک ہو رہی تھی۔ لہٰذا اِن کی موجُودگی کسی طرح سے بھی گم شدہ چیز کی تلاش نہیں کہی جا سکتی بلکہ یہ ایک اقرار کرنے والا فعل ہے جس کے ذریعے سے ایک عالمگیر مقصد پُورا کیا جاتا ہے۔ اُن کی موجُودگی خُداوند یسُوع مسیح کی گم شدہ تعلیم کو دوبارہ حاصل کرنا مقصد نہیں بلکہ ان کا مقصد خُداوند یسُوع مسیح کی اہمیتؔ اُس کے الفاظ اور اُس کے کاموں کا اظہار ہے جو کہ ہمارے لئے بیش بہا خزانہ ہیں اور اہلِ اسلام کے ذہنوں پر انجیل کے بارے میں اس حقیقت کا نقش ثبت کرنا ہمارا پہلا فرض ہے۔

مُسلمانوں کے نزدیک قرآن خُدا کا کلام ہے جو کہ حضرت محمدؐ صاحب پر خُدا کی طرف سے نازل ہُوا تاکہ وُہ فی الفور اس کو اپنے سُننے والوں تک پہنچا دیں۔ یہ وُہ کلام نہیں جو کسی اور نے حضرت محمدؐ صاحب کی نسبت لکھا ہے۔ اس قسم کا کلام جو لوگوں نے حضرت محمدؐ صاحب کی نسبت کہا یا لکھا ہے اس کا نام حدیث ہے جس کی حیثیت قرآن کی نسبت کم ہے۔ اگرچہ حدیث کے ذریعے سے بھی خُدا کی مرضی معلوم کی جا سکتی ہے لیکن قرآن شریف کسی دُوسرے آدمی کے ذہن کے ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچتا اور جیسا کہ کٹر مسلمان مانتے ہیں، یہ نہ ہی محمدؐ صاحب

یا کسی اَور شخص کے ذہنی توٰی کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے بلکہ یہ کلام واقعی خُدا کا کلام ہے کیونکہ نبی محض ایک وسیلہ ہوتا ہے لیکن نئے عہدنامہ کی یہ صُورت حال نہیں ۔ اگرچہ چاروں انجیلیں بلاشک وشبہ خُداوند یسُوع مسیح کے کلام کو بیان کرتی ہیں جو کہ اُس نے زبانی کہا لیکن پھر بھی اناجیل (خاص کر یُوحنا کی انجیل میں) بہُت سے مقامات ایسے ہیں جہاں لکھنے والے بڑی لطافت کے ساتھ اپنے آپ کو بیان میں جذب کر دیتے ہیں ۔ چنانچہ ہم اناجیل میں اختصار، ترتیب، انتخاب، تکرار اَور عینی شہادت پاتے ہیں ۔ اناجیل ان کے لکھنے والوں کے ذہنوں سے ہم تک پہنچتی ہیں اَور بہُت حد تک کلیسیا کا ذہن لکھنے والوں کے ذہن کی پُشت پر تھا ۔ وُہ تاریخ اَور انسانی تجربے کا بیان کرتی ہیں ۔ یہ وُہ تاریخ ہے جو تجربے کے ذریعے لکھی گئی ہے اَور اس حقیقت کو نہایت موزُوں اَور مناسب سمجھنا چاہیئے کیونکہ کلام لفظوں میں جکڑی ہُوئی حقیقت اَور معلُوم شدہ معنی ہوتا ہے ۔ اگر مسیح کو اس طرح جانا جائے جیسے کہ کلیسیا نے اُسے جانا تو اس طرح سے ہم خُداوند یسُوع مسیح کو زیادہ اچھی طرح سے جانتے ہیں بہ نسبت اس کے کہ اُس کو ایک ناقابلِ فہم اَور ایک فریضہ کی صُورت میں جانا جائے کیونکہ تمام تاریخ ایک تجربہ شدہ حقیقت ہے اَور یہ تشریح کے عنصر سے بچ نہیں سکتی ۔ اگر یہ تشریح غیر پسندیدہ اَور متعصب اَور غیر شعُوری ہو تو لوگوں کو اس پر شک گزرتا ہے لیکن نیا عہدنامہ اس خطرے سے

بڑی ہے کیونکہ اس کے لکھنے والے ان بیانات میں سے ہو کر اور محسوسات میں سے گذر کر لکھتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اہلِ اسلام کی یہ بات سمجھنے میں مدد کرنی چاہیئے کہ الہام اوّل شخصی ہوتا ہے اور اس کا انحصار زبان یا الفاظ پر نہیں ہوتا اور یہ لکھنے والوں کے ذہنوں کی اعانت کرتا ہے نہ کہ ان کو پس انداز کرتا ہے اور اس بات سے مجسّم کلام کے سُننے کے لئے سمجھ اور تفہیم پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ اسی سیاق و اسباق میں ہمیں رسُولوں کے خطوط پیش کرنے چاہئیں۔ قرآن کے نقطہ نظر سے رسُولوں کے خطوط ایک بڑا حیران کن اور نا قابلِ تشریح مسئلہ ہے۔ قرآن کے مطابق ایک ذاتی خط و کتابت الہام کا درجہ کیسے اختیار کر سکتی ہے؟ اگر پولُوس رسُول کلسیوں کے نام خط لکھتا ہے تو اس کو ایک آسمانی کتاب کیونکر کہا جائے۔ اس اعتراض کا جواب ضرور دینا چاہیئے کیونکہ ہمارے جواب میں ٹھوس مواد موجود ہے۔

نئے عہد نامے کے خطوط اس بات کے گواہ ہیں کہ انجیل کا الہام انسانی تجربے کے ساتھ مل کر اپنے آپ کو مکمّل اور پُورا کرتا ہے، کیونکہ الہام صرف ایک قابلِ عمل قانون ہی نہیں اور نہ ہی صرف یہ حقائق کا پلندہ ہے اور نہ صرف یہ ایک قابلِ قبُول تاریخ ہے بلکہ یہ ایک تعلّقات کی پیشکش ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس الہام کے ساتھ قانون بھی ہوتا ہے جسے ہمیں ماننا ضرُوری ہے اور اس کے ساتھ حقائق اور تاریخ بھی ہوتی ہے لیکن اصل میں یہ ایک تعلّق ہوتا ہے جو انسانی

رجابت اُور تجربے کے واسطے دیا جاتا ہے۔ اس میں مسئلۂ خُدا کا
مطلب خُدا سے رفاقت مقصُود ہے اُور جب یہ الہام انسان کی نسبت
گُفتگُو کرتا ہے تو اس کا مضمُون توبہ، معافی اُور نئی پیدائش ہے۔ وُہ
جس چیز کا بھی اعلان اُور بیان کرتا ہے وُہ اس کی پیشکش اُور تشریح بھی
کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا اعلان ہوتا ہے جس میں تجربے کی دعوت ہوتی ہے۔
لہٰذا جو کُچھ بھی اس سے مقصُود ہوتا ہے اسے قبولیت سے علیحدہ کر کے
بیان نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا ہم پولُس رسُول کے اُور دُوسروں کے خطُوط
میں دیکھتے ہیں کہ وُہ نومریدوں کی تشریح کر کے سمجھاتے ہیں۔ وُہ انہیں تفصیلاً
اُن کے ایمان کی نوعیت بیان کرتے ہیں۔ وُہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ
اُن کا ایمان اُن کے اخلاق اُور کردار پر کیسے اثرانداز ہوگا، اُور یہ بھی کہ ماضی
سے رشتہ توڑنا اُور ایک مستقبل کا وعدہ ہے مسیحی عقیدہ جس کا بیان اناجیل میں
ہے اس کو ہم پولُس رسُول کے خطوط میں انسانی تجربے میں دیکھتے ہیں۔
خطوں میں جس انسانی تجربے کی تشریح اُور تجزیہ کیا گیا ہے اُسی کی روشنی
میں انجیلوں کے بیانات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ اس طرح ہم نئے عہدنامے
میں ایک وحدانیت اُور یکسانیت پاتے ہیں۔ ہر ایک مسیحی جو کہ اس ایمان
کا ذہنی مرکب ہے اُور الٰہی فضل کا انسانی نتیجہ ہے وُہ اس لحاظ سے
اس الہام میں شامل ہے، چنانچہ خطوط انسان کی حالت کو واضح کرتے
ہیں، اس کو تلقین کرتے ہیں اُور اس کی ساخت اُور کردار بیان کرتے ہیں۔
ان کے ذریعے سے ہم اس بات کو سمجھ پاتے ہیں کہ خُدا کیا کہتا ہے نہ کہ کسی

خُدائی بیان سے جو کہ وُہ کسی محرّر کو دے رہا ہے لیکن رسُولوں کی ابتدائی کلیسیاؤں کو تعلیم کے ذریعے سے جو کہ وُہ پاک رُوح کے مطابق کرتے تھے اور جو تعلیم، زندگی اور اس کی مناسب رفاقت کے متعلّق ہوتی تھی اس کے ذریعے سے ہم خُدا کی کہی ہُوئی بات سمجھتے ہیں۔ چنانچہ الہٰی کلام بنی نوع انسان کی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی میں اس کے اپنے اثرات کے حقیقی نتائج کا بیان ہے جیسا کہ ہم اسے فلپی، رُوم، کرنتھس اور افسس کے حالات میں دیکھتے ہیں۔

ایک اور وجہ ہے جس کی بنا پر رسُولوں کے خطوط کو الہامی کتاب میں جگہ مل سکتی ہے اور یہ وجہ انجیل میں مجمُوعی طور پر اور پُرانے عہدنامہ پر بھی صادق آتی ہے۔ اس وجہ کا تعلق بائبل کے الہام کی واقعاتی نوعیّت ہے یعنی بائبل کا الہام تاریخ کے خاص واقعات سے متعلّق ہے۔ یہ ہر چند ایک مخصُوص حالات میں پیدا ہوتا ہے۔ پولُوس رسُول خواہ کرنتھیوں کی کلیسیا کے مسائل پر لکھ رہا ہو (دُوکانوں میں قربانی کے گوشت کی فروخت) یا گلتیوں کے نام خط لکھ رہا ہو (یہُودیوں کی طرف سے آزمائش) وُہ جن اصُولوں پر خطوں میں بحث کرتا ہے اِن اصُولوں کی حیثیت اور نوعیت دائمی ہے۔ مثال اِن کے اطلاق کی تشریح کرتی ہے اور اس کا شاید پھر اعادہ کیا جائے۔ اگرچہ بالکل اسی حالت میں نہیں تو اس سے ملتی جُلتی حالت میں۔ بہرحال اصُول قائم رہتے ہیں۔ وُہ کلیسیائیں جن کا ذکر خطوں میں ہے ان کے مسائل اور طبیعتوں کو مثالی سمجھنا چاہیئے۔ رسُولی رویّہ

صرف خاص موقع ہی کے لئے نہیں، اس کا اطلاق موقع سے پرے بھی ہے کیونکہ ایک خاص وقت اپنے اندر اپنے سے کچھ زیادہ لئے ہوتا ہے۔ رُومیوں کے نام خط صرف رُومیوں کے نام ہی نہیں ہے۔ اسی طرح فلیمون کے نام کا خط جو کہ ایک بڑا قریبی اور ذاتی خط ہے اس کا تعلق صرف اُسی وقت سے ہی نہیں بلکہ یہ ایک اَبدی ہے نہ کہ صرف اُنیسمس حبشی کے جھگڑے کے متعلق ہے جو بھاگ گیا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ بغیر مثال کے ایک ہمہ گیر حقیقت بھی محض ایک مجرّد اور خیالی حقیقت بن کے رہ جاتی ہے۔ غیر فانی حقیقت کے ماسوا مثال کی حیثیت بے ثبات اور غیر اہم ہے۔ مجسّم حقیقت میں اور ایک اہم مثال میں صحیح الہام کی نشاندہی ہوتی ہے۔ الہام صرف قانون ہی نہیں ہوتا بلکہ اس قانون کی مثال بھی ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف نصیحت ہی کرتا ہے بلکہ سُننے والوں کے لئے نجات کا کام بھی کرتا ہے۔ بائبل کا الہام انسانی زندگی کے بے شمار واقعات کا ذکر کرتا ہے جن میں ہم آسمان کی بادشاہت کے نمونے کا مکاشفہ پاتے ہیں۔ یہ بات اس ایمان کے لئے کتنی موزوں اور مطابق ہے جو یہ بات مانتا ہے کہ کلام مجسّم ہُوا، لیکن ایک مُسلم کے لئے یہ بات حیران کُن اور دُور افتادہ رہے گی جب تک کہ تشریح تفہیم کی امداد نہ کرے۔

واقعات بھی بیشتر پُرانے عہد نامہ کی تشریح میں ممّد ہیں۔ ایچ جی۔ ویلز اپنی مشہور کتاب "A SHORT HISTORY OF THE WORLD" میں بے صبری سے اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ بائبل غیر اہم لوگوں اور غیر معرُوف بادشاہوں کی حکایات بیان کرنے میں زیادہ وقت صرف کرتی

ہے ۔ وُہ اس بات کو نہیں سمجھ پاتا کہ دُوسری چیزوں کے علاوہ بائبل کی اسرائیل قوم میں دلچسپی اس لئے ہے کہ وُہ مسئلہ انسان کی تشریح کرنا چاہتی ہے ۔ ابراہام سے لے کر خرُوج اور بنی اسرائیل کی جلاوطنی تک اور اس کے بعد کے واقعات اس لئے بیان نہیں کئے گئے کہ کوئی اور ضرُوری باتیں نوع انسان کی حکایات میں باقی نہیں رہیں بلکہ اس تمام بیان کا مقصُود انسان کی سرکشی بیان کرنا تھا کیونکہ ان تمام باتوں کا مسیح میں نجات کی تیاری کا ایک خاص ترتیبی مقام ہے کیونکہ بائبل کا مکاشفہ واقعات کے گرد گھومتا ہے اور چونکہ تاریخی واقعات لا تعداد ہیں لہٰذا ان کے بیان کرتے وقت زیادہ سے زیادہ انتخاب سے کام لیا جاتا ہے ۔ خُدا کا تمام تاریخ کے ساتھ جو تعلق ہے وُہ ایک خاص تاریخ کے ذریعے سے سمجھایا جاتا ہے ۔ ایک خاص تاریخ تیار و مرتب کی جاتی ہے جو کہ تمام انسانی تاریخ پر روشنی ڈالتی ہے اور اس کی نجات کا کام کرتی ہے ۔ لہٰذا بائبل ایک خاص پیغمبر کے بیس سالہ عرصہ کے بیان پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ وُہ اٹھارہ صدیاں یعنی ابراہام اور یُوحنا رسُول اور کسدیوں کے اُور UR OF THE CHALDEES سے لے کر جزیرہ پتمس تک تقریباً اٹھارہ صدیوں کے حالات بیان کرتی ہے ۔ اس کے الہام کا تعلق مختلف اور مُنتخب کئے ہُوئے انسانی ردِ عمل سے ہے جو خُدا کی مرضی اور اُس کے کلام کے خلاف بغاوت یا تابعداری میں ظہُور پذیر ہُوا ۔

لہٰذا بڑی سے بڑی پیشین گوئیاں بغیر تاریخی سیاق و سباق کے سمجھ میں نہیں آسکتیں مثلاً عامُوس کی کتاب کی سمجھ نہیں آسکتی جب تک کہ پہلے عمری کی بدکاری اور سریاہ کے مرُوّج کو نہ سمجھا جائے ۔" اگر دو شخص باہم متفق

نہ ہوں تو کیا اکٹھے چل سکیں گے" (عاموس ۳ : ۳) تقدوع میں عاموس پر یہ بات واقعات سے ہی ظاہر ہوئی کہ تاریخی اسباب جن کی وجہ سے تعزیری اسیری یا معرضِ وجود میں آیا، اِن کا سدِّ باب اس راستبازی سے کیا گیا جس میں سامریہ کے انتقام کی ضرورت تھی۔ ہوسیع کا گھریلو المیہ ایک بدکار قوم کے ساتھ الٰہی تعلقات کو سمجھانے کے لئے بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح یرمیاہ یسعیاہ اُور حزقی ایل ان تمام انبیا کو سمجھنے کے لئے اُس زمانے کے تاریخی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ تمام منتخب اُور مخصوص واقعات کی شرح اس لئے کرتے ہیں تاکہ تمام انسانی تاریخ سمجھ میں آ سکے۔

اسی طرح زبور میں نوحہ، شکایت، خوف اُور یاس کی نظموں کو الٰہی الہام سمجھنا ایک مسلمان کے لئے مشکل ہے لیکن یہ تمام نظمیں انسانی زندگی میں خدا کے تصوّر کی نشان دہی کرتی ہیں اُور وہ محسوس شدہ حقیقت کو جو خدا آدمیوں کو پہنچانا چاہتا ہے، بیان کرتی ہے اُور جب انسان خدا کے متعلق اپنی علمی حالتوں سے نبرد آزمائی کر رہے ہوتے ہیں تو خدا ان پر اپنے علم کو وسیع اُور گہرا کرتا ہے اُور اُن سب کے لئے جو اُن کو پڑھتے ہیں یہ کلام زندگی بخش اُور نُور افروز ہوتا ہے۔ مکاشفہ کا یہ عمل اُن تمام خاص آدمیوں کی ذہنی اُور رُوحانی صلاحیتوں کی مدد سے جن پر یہ عیاں ہوتا ہے دُوسرے آدمیوں کے اذہان اُور رُوحوں سے خطاب کرتا ہے۔ چنانچہ جب زبور نویس حمد و ثنا میں مخمور ہوتا ہے تو حقیقت میں یہ الٰہی حقیقت کی تفہیم کی نشان دہی کرتا ہے اُور اس طرح علم الٰہیات قصیدہ گوئی میں منتقل ہو جاتا ہے جو کہ علم الٰہیات کا ایک زُود فہم طرزِ بیان ہے۔ قرآن میں زبور نہیں ہے اُور تاریخ کم ہے اُور اس میں ایک

الہامی تجربے کا نچوڑ ہے اور یہی انجیل و قرآن کے الہامی تصورات میں فرق ہے اور اسی لئے ہم پر اس شرح کا فرض عائد ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن بائبل کے کلام کی نوعیت کے سلسلے میں ایک اور بات کہنا کافی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کے متعلق اس کا بیان حقیقت پسندی پر مبنی ہے خواہ یہ ابرہام کی کہانی ہو یا داؤد کی یا خداوند کے شاگردوں کے خاکے ہوں۔ یہ تمام کے تمام بلاکم و کاست وہاں موجود ہیں۔ بیان کرتے وقت نہ برائیوں کو چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے اور نہ ہی کمزوریوں کو کم کرنے کی، اس لحاظ سے وہ بیانات نوعِ انسان کا پیمانہ ہیں جس کو خدا بچانا چاہتا ہے، چونکہ وہ آدمی بھی ہماری طرح جذبات رکھتے تھے لہٰذا ہمیں ان کی طرح اُمید اور ایمان حاصل ہو سکتا ہے اگرچہ ایک مسلمان خدا کے رحیم ہونے کے مسئلے کی وجہ سے انسان کی کمزوری سے بخوبی واقف ہے لہٰذا وہ انسانی کمزوریوں کے لئے تیار بھی ہے تاہم وہ نبیوں اور پیغمبروں میں یہ کمزوریاں نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس کے علاوہ قرآن، اسلام اور غیر اسلام میں جو فرق ہے اس پر عقیدے کے لحاظ سے بہت زور دیتا ہے چنانچہ مسلمین یا مومنین فائدے میں ہیں اور کافر اور نہ ماننے والے نقصان میں ہیں۔ اگرچہ اخلاقی باتوں میں قرآن بہت امتیازی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ اخلاقیات زیادہ تر عقیدے پر مبنی ہیں۔ لہٰذا مومنین میں باطنی برائی کم سمجھی جاتی ہے۔ یہ اس مکاشفہ کا قدرتی نتیجہ ہے جبکہ شریعت ہر اُس چیز کو جو کہ اُس سے باہر ہے اس کو قابلِ تعزیر ٹھہراتی ہے اور ہر اُس چیز کو جو اُس کے دائرے کے اندر رہتی ہے پسند کرتی ہے لیکن کفارہ ہر ایک انسان کا قدرتی گنہگار ہونا ماننا

ہے اور پھر ہر ایک کی نجات کے لئے تیار ہوتا ہے۔ انسان اور خدا سے متعلق بائبل کے اس نظریے کا پہلو بہت اہم ہے لیکن ساتھ ہی اس کو مسلمان کے ذہن میں اُتارنا بہت مشکل ہے۔

۴۔ اب ہم دیکھیں گے کہ یہ تمام نکتے بائبل اور قرآن کے متضاد الٰہی تصورات سے پیدا ہوتے ہیں جب ایک مسیحی اپنے عقائد کی تشریح مسلمانوں کے سامنے کرتا ہے تو اس کو چند باتوں کا خیال رکھنا ہے۔ خصوصاً وہ باتیں جو کہ مسلمانوں کے بائبل کے متعلق رویے سے پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن کا مواد بھی اسی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے جس کا ذکر پُرانے عہدنامہ میں ہے مثلاً قرآن پیدائش اور بنی آدم کے زوال کا ذکر کرتا ہے۔ نبیوں اور شریعت کا ذکر کرتا ہے اور پھر خداوند مسیح کی پیدائش کی نسبت دو طویل ذکر کرتا ہے۔ چونکہ قرآن میں بائبل کی تاریخ شامل ہے اور قرآن اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ آخری الہامی کتاب ہے جو اپنے اندر آدم سے لے کر مسیح تک تمام انبیا کا ذکر کرتا ہے۔ اس دعویٰ کی وجہ سے قدرتی طور پر مسیحیوں اور اہلِ اسلام کے درمیان ایک عجیب کشمکش رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسیحیوں کا خاص اور مثبت کام مسیحیوں اور اہلِ اسلام کے مابین مباحثات اور مناقشات کی وجہ سے مشکل ہو گیا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ایک خاص دائرے کے اندر رہنی چاہیئے اور اس کو تشریح کے کام میں مخل نہیں ہونا چاہیئے۔ تاہم باہمی مناقشات کی باتیں بالکل نظرانداز نہیں کی جا سکتیں۔

جہاں کہیں پُرانے یا نئے عہدنامہ اور قرآن کے درمیان بیانات میں تضاد نظر آتا ہے تو مسلمان اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ انجیل مسخ ہو

گئی ہوئی ہے مثلاً پرانے بزرگوں کی کہانیوں میں جو تضاد نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں بتلائی جاتی کہ آنحضرت محمد صاحب کے علم کے وسائل مختلف تھے بلکہ اِن کی تشریح یوں کی جاتی ہے کہ اصل بائبل کی تحریف کی گئی ہے۔ اسلام مسئلہ تحریف پر زور دیتا ہے۔ خصوصاً مسیح کی نسبت قرآن اور انجیل کے بیانوں میں جو تضاد ہے ، اس کی تشریح مسئلہ تحریف کے ذریعے کی جاتی ہے ۔ اہلِ اسلام حجّت کرتے ہیں کہ یہودی اور مسیحی جنہوں نے واضح طور پر عرب میں حضرت محمدؐ صاحب کی نبوّت کو قبول کرنے سے انکار کیا، وہ اپنی الہامی کتابوں کے بھی صحیح محافظ نہیں تھے ۔ لہٰذا اُنہوں نے ان کتابوں میں مختلف مقامات پر تبدیلیاں کر دی ہیں اور خصوصاً اُن حصّوں کو دبا دیا ہے جو قرآن کی تصدیق کرتے ہیں اور جن کی بنا پر ہم کہہ سکتے تھے کہ وُہ قرآن سے بالکل ملتے جُلتے ہیں۔ اہلِ اسلام اس بات پر ہرگز غور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ حقیقت میں بائبل کی تحریف کبھی عمداً نہیں کی گئی کیونکہ بائبل حضرت محمدؐ صاحب کے آنے سے تین سو سال پہلے مکمّل اور مستحکم ہو چکی تھی اور اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کے خلاف نادانستہ تحریف کی گئی ہے تو یہ ایک بہت غیر معقول حجّت ہے۔

اہلِ اسلام کے نکتۂ نگاہ سے موجودہ بائبل قرآن کے ساتھ پوری نہیں اُترتی اور یہ کہ حقیقی بائبل پوری اُترتی تھی۔ لہٰذا تحریف ایک حقیقت ہے ۔ یہ ایک اور بات ہے کہ اصل بائبل کبھی ملی بھی ہے یا نہیں۔ قرآن کے اندر اس کا کافی حصّہ موجود ہے۔ اہلِ اسلام کی حجّت ایک ایسے مفروضے پر مبنی ہے جس کو نہ صحیح اور نہ ہی غلط ثابت کیا جا سکتا ہے یہ ایک ایسی حجّت ہے کہ یہ وہیں پر ختم ہو جاتی ہے جہاں سے شروع ہوتی

ہے۔ قرآن ایک ناقابلِ تحریف کتاب ہے اور دُوسری تمام سچّی الہامی کتابیں اس کی تصدیق کرتی ہیں اور بائبل چونکہ اس کی تصدیق نہیں کرتی لہٰذا بائبل تحریف شدہ ہے اور اس تحریف کی تصحیح ان حِصّوں سے کی جا سکتی ہے جن کا ذکر قرآن میں ہے۔

تھوڑے سے قیاس پر یہ بات اچھی طرح سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس قسم کے بندخیال یا نقطۂ نظر میں کسی قسم کی سرایت بُہت مُشتبہ ہے۔ اس بات پر کسی طرح ڈٹے رہنا کہ بائبل کی کُتب کا مجموعہ چوتھی صدی سے بالکل نہیں بدلا اور یہ کہ یہ اُسی وقت سے مُسلّمہ دستاویز چلی آتی ہے ایک تاریخی حقیقت ہے۔ لیکن اس اسرار کا ایک متعصّب ذہن پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر دو مذہبی کتابوں کا آپس میں تضاد ہے تو اس میں سے تحریف شدہ بائبل ہی ہے۔ ہم جو مسیحی مؤرخ اور علما ہیں ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اہلِ اسلام کو مختلف مذہبی کتابوں کے مابین جو رشتہ ہے اس کی جانب غیر جانبدار رویّہ اختیار کرنے کے لئے کوشش کریں۔ اس معاملے میں کبھی کبھی اُمید کی جھلک نظر آتی ہے لیکن یہ آسان رستہ نہیں ہے کیونکہ اس مسئلے کا تعلّق اس بات سے ہے کہ قرآن کس نقطۂ نگاہ سے الہامی ہے۔

۵۔ اس معاملے میں جو مسیحی متن اور دُوسری تنقید کا اثر ہے اس کو سمجھنے کے لئے صرف تھوڑی سی اور خیال آرائی کی ضرورت ہے۔ پڑھے لکھے مسلمان اُن طویل تنقیدوں سے بے خبر نہیں ہیں جو کہ خود مسیحیوں نے بائبل کی نسبت کی ہیں۔ اگرچہ بہتوں نے بذاتِ خود ان بحثوں میں حصّہ نہیں لیا اور نہ ہی ان یُونانی و عبرانی علمی ضوابط کو حاصل کرنے کی زحمت اُٹھائی ہے جن کے ذریعے سے ان بحثوں کو سمجھا جا سکتا ہے لیکن اکثر مسلمانوں نے انجیل کی

RENAN - STRAUSS - BAUER اور KESOPP LAKE کے نسبت
مبحثوں کو سُنا ہُوا ہے ۔ بہُت سے مُسلم نقّاد ان خیالات کی تائید کرتے ہیں
کہ تاریخی مسیحیت کو پولوسیت کہا جائے ۔ وُہ اس مفروضہ سے پوُری طرح واقف
ہیں کہ ایک سادہ گلیلی اُستاد کو بغیر وجہ کے عقیدے والے مسیح میں تبدیل کر دیا
گیا ہے ۔ اس مفروضہ کو اگر مُسلّمہ قرار دیا جائے تو اس کے مطابق سادہ گلیلی
اُستاد کی تصویر قرآن والے عیسٰی سے بہُت حد تک منطبق ہو جائے گی ۔
قرآن والے مسیح سے متعلّق جو بحث ہوتی رہی ہے اور جس بحث میں نئے
عہدنامہ کے مسیحی و غیر مسیحی علما حِصّہ لیتے رہے ہیں اس کی وجہ سے اہل
اسلام کی دلچسپی بھی اس مضمون میں بڑھتی رہی ہے لیکن ابھی تک یہ
نہیں کہا جا سکتا کہ اُنہوں نے مسیح کا متواتر اور مکمل مطالعہ کیا ہو جس میں
اس کی تمام جمع شدہ گواہی کا جائزہ لیا جائے ۔
برعکس اس کے نئے عہدنامہ کی اس تنقید کی بنا پر مُسلمان مسیحی الہامی
کتابوں کو ناقابل اعتماد سمجھتے رہے ہیں اور اس تنقید کو اس کا بیّن ثبوت
سمجھتے ہیں مُسلمان دراصل ان مطالعہ جات سے متعلّق تحقیقی اور سائنسی
آزادی کے مطالعہ کو تو سمجھتے نہیں اور جو عام مُسلمان ایسی تنقید سے آشنا
ہوتا ہے ، وُہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ مسیحی بھی اپنی الہامی کُتب کی صحت کے
متعلّق ڈانواڈول ہیں اور وُہ فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیتا ہے کہ نئے عہدنامے میں
وُہ ناقابلِ تردید صحت موجُود نہیں جو قرآن میں ہے ۔
علاوہ ازیں کتاب مقدس کے بہُت سے ترجموں کا ہونا بھی مُسلمانوں
کے نزدیک پریشان کُن ہے اور ان ترجموں کی بہتات کی وجہ سے ان کی
صحت کے بارے میں اُن کے شکوک اور زیادہ بڑھ جاتے ہیں ہمیں یہاں

یاد رکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں نے صرف بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی سے ہی غیر اسلامی زبان میں قرآن کے ترجمہ کو قبولیت کی نظر سے دیکھنا شروع کیا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ بہت سے غیر مسلم لوگوں نے اس کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا، لہٰذا ایک مسلمان کا ذہن بائبل کے مختلف ترجموں کو کما حقہٗ طور پر سمجھنے سے قاصر ہے اور نہ ہی وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایک الٰہی پیغام کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے بعض اوقات مختلف قیاس آرائیاں اور ترجمے ضروری ہوتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ جیسے ہی زبان اور خیالات کے باہمی تعلق کو سمجھا جائیگا ویسے ہی بائبل سے متعلق شکوک اور غلط فہمیاں بھی دور ہوتی جائیں گی لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا، بائبل کی صحت سے متعلق یہ غلط فہمیاں بدستور جاری و ساری رہیں گی۔

جب ہم اہل اسلام سے ان الہامی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جو مسیحیوں کے پاس ہیں تو کئی اور غلط فہمیوں کا سراغ ملتا ہے۔ ایک بڑی غلط فہمی کا آغاز یوں ہوا کہ ماضی میں مسیحی مبلغ بائبل پر کس طرح زور دیتے تھے۔ اس غلط فہمی کا تعلق پیشگوئی کے پورا ہونے سے ہے۔ ابتدائی زمانہ میں مسیحی مذہب کے حامی الکندی (ALKINDI) اور دمشق کے یوحنا کے زمانہ سے لے کر دلیل پیش کرتے تھے کہ مسیح خداوند کی نسبت پیشین گوئی موجود ہے لیکن حضرت محمدؐ صاحب کی نسبت کوئی پیشین گوئی نہیں۔ اُنیسویں صدی میں یہ دلیل اکثر استعمال کی جاتی تھی اور جو مسیحی یہ دلیل استعمال کرتے تھے وہ اسے صحیح اور سالم سمجھتے تھے لیکن اس دلیل کے جواب میں مسلمانوں کی مخالف دلیل زیادہ بعید نہ

تھی، اُن کی مخالف دلیل تحریف پر مبنی تھی اور وُہ یہ کہتے تھے کہ حضرت محمدؐ صاحب کی نسبت پیشین گوئیاں اس لئے نایاب ہیں کیونکہ ان کو دبا دیا گیا ہے لیکن وُہ سب کی سب دبائی نہیں گئیں۔ نئے اور پُرانے عہدناموں میں حضرت محمدؐ صاحب کی نسبت کچھ پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ وُہ کہتے ہیں کہ الہامی کتابیں تمام کی تمام تحریف نہیں کی گئیں۔ اِن میں چند مقامات ایسے ہیں جو غیر منسوخ ہیں اور ایک مسلمان تمام الہامی کتابوں کی ناگزیریت کی بنا پر اُن مقامات (اقتباسات) کو پیش کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور قرآن کی طرف سے بھی اُسے تلقین ہے کہ قرآن سے پیشتر الہامی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ ایسا کرتے وقت وُہ موجودہ بائبل میں سے وُہ تمام حوالہ جات نکال لیتا ہے جو مخصوص اسلامی تفسیر ہوتے ہیں۔ وُہ خُوش ہو کر مسیحی کو بتاتا ہے کہ خود بائبل حضرت محمد صاحب کی پیشین گوئی بیان کرتی اور تعریف کرتی ہے۔

چنانچہ نئے اور پُرانے عہدناموں کی مُسلم تفسیریں جو مُسلم نکتۂ نگاہ سے کی گئی ہیں، اکثر ملتی ہیں۔ گویا یہ مفسرین کہتے ہیں کہ کیا حضرت محمد صاحب کی نسبت پیشین گوئی کی نہیں گئی؟ ہاں! بلکہ اکثر و بلبشتر تمہاری اپنی الہامی کُتب میں موجود ہے۔ اگرچہ یہ تفسیر اکثر اوقات مشکوک اور کھینچ تان کر کی جاتی ہے لیکن چند اسلامی مفروضات اور قدرے ذہنی اختراع کے ذریعہ اس کو کافی حد تک قرینِ قیاس بنایا جا سکتا ہے۔ بائبل کی تفسیریں جو مُسلمانوں کی ہیں وُہ مسیحیوں کے احساسِ خدمت، صبر اور تبلیغ کی مزید مقتضی ہیں۔ ہندو اور پارسی مذہب کی الہامی کتابوں کو بھی اسی طرح تفسیر کیا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کی سب سے زیادہ جاں سوز اور نمایاں مثال وُہ مشہور یُونانی لفظ ہے جس کا ترجمہ یُوحنا کی انجیل میں مددگار یا تسلی دینے والا کیا گیا ہے یعنی παρακλητος اس کے حرُوف تہجی کی ترتیب وہی ہے جو یُونانی زبان کے لفظ περικλυτος کی ہے اور جس کا مطلب "حمد کے لائق" ہے۔ نئے عہدنامہ کے سیاق وسباق کی رُو سے اُس لفظ کی جگہ یہ لفظ پڑھنے کے لئے کوئی جواز موجُود نہیں لیکن عربی زبان میں محمدؐ، احمد یا محمود کی اصل کا مطلب "حمد کے لائق" ہے اور یہ اصل περικλυτος سے ملتی جُلتی ہے۔ اس بنا پر یہ کہا گیا ہے اور اسلامی حلقوں میں اس بات کو اکثر وسیع پیمانہ پر مانا جاتا ہے کہ رُوح القُدس کے وعدہ سے مُراد حضرت محمدؐ صاحب یعنی خاتم النبیین ہے۔ حرُوفِ علّت کی تبدیلی جس کی وجہ سے περικλυτος بن گیا، مسیحی تحریف کے نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ الزام اور اہلِ اسلام کی تبدیلی تفسیر کے لحاظ سے بےبُنیاد ہیں اور نہ ہی اُس حوالے کا مفہُوم اسلامی تفسیر کا حامل ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ تشریح تفسیر پر نہیں بلکہ موہوم مفرُوضات پر مبنی ہوتی ہے اور اگرچہ یہ ایک جاں سوز ضرُورت ہے تاہم مسیحیوں کو حضرت محمدؐ صاحب اور رُوح القُدس کے درمیان صاف تمیز کرنے کے کام کو خُوشی سے برداشت کرنا چاہیئے اور اس بات کو بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک مُسلمان اس معاملے میں اتنا اعتماد کے ساتھ کیوں گمراہ ہے۔

مسیحی مذہبی کتابوں کی اہلِ اسلام کے لئے توضیح کرتے وقت

ایک اور مزید نقطے کا خیال رکھنا چاہیئے۔ انجیل اور قرآن کے عقیدے کے درمیان جو چند ایک اختلافات ہیں ان کی تشریح مسئلہ تنسیخ کے ذریعے کی جاتی ہے۔ مسئلہ تنسیخ کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں آنے والے الہام پہلے الہاموں کو منسوخ کر دیتے ہیں۔ نتیجتاً بائبل کے بعض بیانات خواہ تحریف سے بالکل مبرا ہوں لیکن صحت سے بالکل خالی ہیں۔ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پہ یہاں بحث نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے اس عقیدے کو تقویت پہنچتی ہے کہ بائبل قرآن میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی اور یہ کہ قرآن بائبل کے بغیر بالکل مکمل ہے لہٰذا کسی ایسے غیر مذہب کی پیروی کی چنداں ضرورت نہیں جب اپنا مذہب اس پر فوقیت رکھتا ہے۔

اس نقطۂ نگاہ سے بائبل ایک نادر یافت شدہ خزانہ ہے جو پہلے ہی ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کی حالت اُس قیدی کی مانند ہے جو اپنا حال اس لئے بیان نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے۔ جب حالت یہ ہو تو مسیحیوں کو کتابِ مقدس کی ذاتی خوبیوں پر بھروسہ رکھنا چاہیئے اور لوگوں کو بائبل کے مضمون کی طرف متوجہ کرانا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم تنسیخ کے ماننے والوں کو اس بات پر آمادہ کر سکیں کہ وہ منسوخ شدہ بائبل کی موجودگی قرآن میں مکمل طور پر ثابت کرنے کے لئے بائبل کا تنقیداً مطالعہ کریں۔ بہرحال بائبل میں یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا خزانہ ثابت کر سکتی ہے جس کی نسبت پہلے سے کچھ نہیں کہا

جا سکتا۔ یونس کی طرح اس کی حالت اُس قیدی کی سی ہے جو قید میں بھی اپنا پیغام سُنا سکتا ہے لیکن اس حالت میں اس مقید شہزادے کی فضیلت اور بزرگی کو دُور رس اور دُور اندیش لوگوں کی خدمت کے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔

خُداوند مسیح کی شخصیّت کی توضیح

قرآن میں آیا ہے کہ "خُدا نہ کسی سے پیدا ہُوا اور نہ ہی کوئی اُس سے پیدا ہوتا ہے" (سورہ ۱۱۲: ۳) اور اسی طرح از رُوئے قرآن مسیح کے ابن اللہ ہونے کی تردید ہو جاتی ہے۔ اگر اس عقیدہ کو تسلیم کر لیا جائے تو ہم ایک انسان کو خُدا کا شریک بنا دیتے ہیں اور اس کا مرتبہ ایسے معبود کے مرتبے تک پہنچا دیتے ہیں جو صرف خُدا ہی کا حق ہے۔ اگر خُدا کے علاوہ کسی اور کو خُدا مانا جائے تو یہ اسلام کے بُنیادی عقیدہ کے منافی اور گناہ کبیرہ ہے۔ اگرچہ قرآن مسیح کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس امر کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا کہ ایسا ہی شخص خُدا ہو سکتا ہے۔

لہٰذا یہ بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی توضیح سے مسیحی لوگ فرار اختیار نہیں کر سکتے اور اس صُورت میں مسیح کی نسبت ایک سیدھا سادھا توضیحی بیان کافی نہیں۔ اگر ہم مسئلہ الُوہیت پر زور دیں تو یہ بھی اس کا کوئی حل نہیں، کیونکہ الُوہیت کی نسبت مسئلے پیدا ہی

کافی ادق اور پیچیدہ ہیں اور مسئلۂ تجسّم پہلے ہی مسئلہ اُلوہیت سمجھا جاتا ہے اور اس وجہ سے اس کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اسلام مسئلۂ تجسّم کے بارے میں مسیحی عقیدے کی مخالفت کرتا ہے تو اس بنا پہ نہیں کہ یہ مسئلہ مسیح کی شایانِ شان نہیں بلکہ اس لئے کہ یہ خدا کے لائق نہیں۔ لہٰذا ہم اس مسئلہ کو علمِ الٰہی سے شروع کر کے حل نہیں کر سکتے بلکہ جتنا زیادہ ہم اس طریقہ سے مسیح کو مسلمانوں کو سمجھانے کی کوشش کریں گے اتنا ہی یہ مسئلہ پیچیدہ ہوتا جائے گا۔ مسیح کا یہ کہنا بے فائدہ نہیں تھا۔ "تم خدا پہ ایمان رکھتے ہو مجھ پر بھی ایمان رکھو۔"

کیا اب اگر مسیح کو بطور انسان کے پیش کیا جائے تو یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اگر اسلام کی خاطر مسیح کی توضیح میں صرف ان باتوں پر زور دیا جائے جو مسلمان کے نزدیک قابلِ قبول ہوں تو یہ خداوند مسیح کے ساتھ بے انصافی ہے۔ ہم اسے ایک پیغمبر سمجھ کر گلیل میں ہی نہیں چھوڑ سکتے جہاں وہ خود بھی نہیں ٹھہرنا چاہتا بلکہ یروشلیم تک مصلوب ہونے کے لئے جاتا ہے جہاں لوگ اُسے محض ایک پیغمبر سمجھ کر ہی اذیت نہیں دیتے۔ ہم خداوند مسیح کی توضیح اِن الفاظ و اصطلاحات کے بغیر نہیں کر سکتے جو اُس نے خود اپنے لئے استعمال کئے ہیں۔ اِن میں وہ الفاظ اور اصطلاحات بھی شامل ہیں جن پر کلیسیا کا ایمان مسیح کی اُلوہیت پہ مبنی ہے۔ مزید برآں مسیح کو محض ایک پیغمبر اور اُستاد ماننا مسلم ضرورت کو پورا نہیں کرتا۔ تاریخی عقیدے کا مسیح ایک ناقابلِ گریز شخصیت ہے اور صرف اسی شخصیت کو ہمیں اہلِ اسلام کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ اس توضیح کے وقت ہمیں مسیح اور گناہ کا تعلق، انسانیت کا کھویا جانا اور خدا کو سمجھنے میں مسیح کا

بھرپور تعلق ، ان تمام باتوں کی توضیح کرنا چاہیئے ۔لیکن اس کو کیسے سرانجام دیا جائے ۔ یہ ابھی تک ایک گراں بار مسئلہ ہے ۔ہمیں اس امر کو ہر قیمت پر سیکھنا ہے کہ ہم مسیح کو ایک مجسم نجات دہندہ کے طور پر جیسے کہ ہم اُسے تسلیم کرتے ہیں ، مسلمانوں کے سامنے کیسے پیش کریں اور ہمیں یہ کام ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں کرنا ہے جنہیں اہل اسلام آسانی سے سمجھ سکیں ۔

بیشک ہمارا پہلا کام خداوند یسوع مسیح کی شخصیت اور کردار کا بیان ہوگا جیسا کہ اناجیل میں بیان ہے ۔ فرض کرو کہ ہم نے انجیل کے متعلق مندرجہ بالا مشکلات پر قابو پا لیا ہے تو پھر یقینی طور پر ہمارا کام اہل اسلام کو نئے عہدنامہ کے بیان سے مطلع کرنا ہے ۔ ان سب میں ہمیں بیان اور محاورے کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا ۔مثلاً مرقس رسول اپنی انجیل ان الفاظ سے شروع کرتا ہے " یسوع مسیح ابن خدا "۔چنانچہ پہلی ہی آیت میں مسلمانوں کے لئے ٹھوکر موجود ہے ۔ یہ بات ناقابل گریز ہے کیونکہ مرقس رسول نے یہ بات ایک بالغ ایمان کے نقطۂ نظر سے لکھی تھی لیکن یہ ممکن ہو سکتا ہے اور بعض حالتوں میں یہ دور اندیشانہ بات بھی ہے کہ مسلمانوں کو انجیل کے چند منتخب بیانات اور حوالوں سے مسیح سے واقف کرایا جائے تاکہ وہ ابتدا میں ہی مخالفت پر آمادہ نہ ہو جائیں ، لیکن ہمیں یہ بات عیاں کر دینا چاہیئے کہ یہ تمام حوالے چیدہ چیدہ اور متعارفی ہیں ۔یہ ہمارے مکمل کام کو تھوڑی دیر کے لئے التوا میں رکھ سکتے ہیں لیکن اس کی جگہ نہیں لے سکتے ۔

ہمارے پورے وثوق کی بنیاد اس حقیقت پر ہونی چاہیئے کہ مسیح کے شاگردوں اور دوسرے مبلغوں نے خداوند یسوع مسیح کی شناخت

کی نسبت پُورا ایمان شخصی تجربوں سے حاصل کیا اور نہ صرف ان عقاید کی بُنیاد پر۔اب ہمارا مقصود مُسلمانوں کو ایسی راہ پہ لے جانا ہوگا یعنی اُنہیں وہاں سے شروع کرنا ہوگا جہاں سے مسیح کے شاگردوں نے شروع کیا تھا۔ خداوند یسوع مسیح کی شخصیت کی مکمل تشریح اُس کی دریافت کے بغیر مشکل ہے۔ اہل اسلام پطرس، یعقوب اور یوحنا سے بڑھ کر ایک خدا کو ماننے والے نہیں۔ اگر ہم اہل اسلام کا مسیح کی نسبت تجربہ اِس ترتیب سے شروع کریں جس طرح اُن کے شاگردوں کا تجربہ ہوا تھا تو ہم بالکل غلطی نہ کریں گے "یہ کس قسم کا آدمی ہے"؟ اس سوال کے معقول جواب کے خلاف خواہ اِن کا کتنا ہی تعصّب کیوں نہ ہو، خداوند یسوع مسیح ہر نسل کے انسان کو یہ پوچھنے پر مجبور کر سکتا ہے کہ "یہ کس قسم کا آدمی ہے"؟ ہم صبر سے کام لیں۔ یہ اقرار کہ "تُو زندہ خدا کا بیٹا مسیح ہے" ابتدائی ایمان سے پیدا نہیں ہوتا جبتک کہ ہم مسیح کو پُوری طرح سے پیش نہ کر دیں تو نئے عہدنامہ کے مطابق ہمیں اس بات کا کوئی حق حاصل نہیں کہ ہم کو مسیح کی نسبت ایک راسخ اور کٹر جواب شروع ہی میں مل جائے۔

اس بات کا ذکر کہ ایسی توضیح کیسے کرنی چاہیئے ہم اُس وقت بیان کر چکے ہیں جب ہم قرآنی مسیح پر بحث کر رہے تھے۔ ہم مسیح کی نسبت اِن تمام پہلوؤں کو تفصیلاً بیان کر کے جن سے کہ اہل اسلام اچھی طرح واقف نہیں ہیں اُن کو مسیحی عقیدے تک لا سکتے ہیں جہاں اِن کو یہ معلوم ہوگا کہ مسیح کون ہے؟ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اُلوہیت کا مکاشفہ انسانیت کا مکاشفہ بھی ہے۔ ہمارے نزدیک خداوند مسیح انسانی

زندگی کی کاملیت کا ایسا پیمانہ ہے جس سے خُدا کی مرضی ظاہر ہوتی ہے اُور یہ مرضی اُس وقت پُوری ہوتی ہے جب انسان مکمل طور پر خُدا کے ساتھ پیوست ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ بات عیاں کر دینی چاہیئے کہ مسیح کی نسبت مسیحیوں کا عقیدہ حقائق پر ٹھونسا نہیں گیا بلکہ یہ حقائق سے ماخوذ ہے۔ ہماری خواہش ہے اُور دُعا بھی ہے کہ اہلِ اسلام حقیقی مسیح سے اس طرح آگاہ ہو جائیں تاکہ ان کو معلوم ہو کہ مسیحی لوگ اُور مسیحی مذہب خُداوند یشوع مسیح کی توضیح تاریخی اُور روائتی عقاید کے مطابق کیوں کرتا ہے۔ مسیح کی نسبت ہمارا جو ایمان ہے وُہ ایک کٹّریت اُور دقیق قسم کی عقیدہ پسندی معلوم نہیں ہونی چاہیئے بلکہ اس عقیدے کے واسطے ہمارے پاس جائز اُور معقول وجُوہات ہونی چاہئیں۔ یہ خُدا کا پاک رُوح ہے جو اناجیل کے ذریعے اُور مسیح کی کلیسیائی جماعت کے ذریعے انسانی دماغ کو اُس عقیدے تک پہنچاتا ہے جو کہ شاگردوں کا تھا۔ ہمارا مقصد تمام لوگوں کو اُس راہ پہ لے جانا ہے اُور اُن حقائق سے روشناس کرانا ہے اُور تجربے کی اُس راہ پر لے جانا ہے جس پر چلکر پہلے لوگوں نے خوف اُور احترام کے ساتھ مسیح کو خُدا کا بیٹا کہنا سیکھا تھا۔ خُداوند یشوع مسیح سے متعلق ایمان اُس سے کسی حالت میں بھی علیحدہ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ وُہی اس ایمان کی تشریح کرتا ہے اُور یہ ایمان اُس کی طفیل پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے پہل جس چیز کا ہم نے ذکر کرنا ہے، وُہ عقائد نہیں بلکہ تجربہ ہے جس کے ذریعے سے عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔

لیکن جب ہم حقیقی خُداوند یشوع مسیح کے الفاظ، اُس کے کام، اُس کے

معنی اور اُس کی بشارت سے لوگوں کو اپنی الہیت کے مطابق جو کچھ بھی ہوسکتا ہے واقف کرا سکیں تو ہمیں پھر بھی اُس کے متعلق اس ایمان کی توضیح کرنی ہے جو کہ منجانب خُدا ہے۔ اگر ہم خُداوند یسوع مسیح کی دنیاوی موجودگی میں رہ کر اُس کی الوہیت کے قائل ہیں پھر بھی نئے عہدنامہ کے الفاظ میں ہم کو اس آیت کی توضیح کرنا ہے جب ہم خُدا کو یہ کہہ کر پُکارتے ہیں کہ "ہمارے خُداوند یسوع مسیح کے باپ"۔

اس بات کا جواب ہمیں ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں بیان کرنا ہے جس کو کہ اہل اسلام آسانی سے سمجھ سکیں یعنی خُدا کی نسبت دوہرا ایمان جس کے ذریعے سے وُہ مظہر ہے اور قادرِ مطلق بھی ہے۔ ہم ابتدا ہی میں الٰہی محبت کے تصور کا ذکر نہیں کرتے اور نہ ہی اِن تمام بھیدوں کا جو خُدا کی مرضی میں سربستہ ہیں۔ ہم اہل اسلام کے ان دو بُنیادی عقیدوں پر اکتفا کریں گے یعنی کہ خُدا مظہر اور قادرِ مطلق ہے۔

یہ بات سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ خُداوند مسیح کی نسبت مسیحیوں کا عقیدہ وُہی ہے جو کہ الٰہی مکاشفہ کی نسبت عقیدہ ہے یعنی "اگلے زمانے میں خُدا نے باپ دادا سے حصّہ بہ حصّہ اور طرح بطرح نبیوں کی معرفت کلام کرکے اس زمانہ کے آخر میں ہم سے بیٹے کی معرفت کلام کیا" (عبرانیوں ۱:۱-۲)۔ "نبیوں کی معرفت، بیٹے کی معرفت"۔ یہ مکاشفے کی مہم کے ابتدائی اور آخری مراحل ہیں۔ بیان کردہ تاریخ، ایک مادی حالت میں ایک شخصیت آ موجود ہوئی جو کہ خُدا کے مکاشفے کو بغیر کسی غلطی کے ایک جگہ

جمع کر دیتی ہے۔ یہ مکاشفہ زبانی بھی تھا کیونکہ اُس نے لوگوں کو سکھایا اَور تعلیم دی اَور یہ ایک واقعہ بھی تھا کیونکہ وُہ اس دُنیا میں رہا اور اُس نے تکلیف اُٹھائی اَور یہ شخص بھی تھا کیونکہ وُہ خود اس میں موجود تھا نہ کہ محض اُس کے الفاظ۔ ہم اس سارے پہلو کو واقعہ کہہ سکتے ہیں۔ بیت اللحم، گلیل، سوخار، یروشلیم کی ہیکل، بیت عنیاہ اَور گلگتا، ان تمام مقامات کے ذریعے ایک شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔

خود خُداوند یسُوع مسیح کے مطابق اَور اس ایمان کے مطابق جو کہ اُس نے پیدا کیا، یہ ایک الٰہی منصُوبہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اہلِ اسلام اس بیان کو تسلیم نہ کریں لیکن ہمارا فرض ہے کہ اُن پر یہ واضح کریں کہ یہ کیا حقیقت ہے جس کو وُہ رد کر رہے ہیں۔ وُہ خُداوند یسُوع مسیح سے متعلق ہمارے ایمان کو، ایک انسانی اُستاد کو خُدا بنا دینے کے مترادف سمجھتے ہیں اَور وُہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیز مکاشفے کی کفایت کی صُورت میں اُس کے مقام کے مُنافی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکاشفہ کی کفایت میں اُس کا مقام یہی ہے۔ ایک اُستاد کو خُدا بنا دینا کُفر ہے لیکن اس بات کو تسلیم کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس بات کو بھی تسلیم نہ کیا جائے کہ خُدا خود اُستاد بن سکتا ہے۔ اسلام کے متعلق یہ قابلِ افسوس بات ہے کہ وُہ مسیحی ایمان کی تردید غلط مفروضوں کی بنا پر کرتا ہے یعنی اس بنا پر جس کا ہمارے ایمان میں ذِکر ہی نہیں ہے۔ ہم نے ایک اُستاد کو خُدا نہیں بنایا بلکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ خُدا نے مسیح میں ہو کر اپنے بارے میں انسانی

تعلیم کا خود انتظام کیا۔

اس بات کو اچھی طرح سے واضح کر دینا چاہیئے کہ مسیحیوں کا مسیح کی بابت ایمان خُدا کے اُس مکاشفہ کے وثوق پر مبنی ہے جس کو اہلِ اسلام مانتے ہیں لیکن مسیحی ایمان کے مطابق مکاشفے کے حصُول کا مختلف نظریہ ہے۔ یہاں یہ بیان کر دینا چاہیئے کہ خُدا کا مکاشفہ خُدا ہی کر سکتا ہے۔ اس گہری حقیقت کی بازگشت مسلمانوں کے خود اپنے اسلامی فکر میں پائی جاتی ہے یعنی خُدا اپنے آپ کو اپنے ہی ذریعے انکشاف کرتا ہے۔ اگر خُدا ایک شخصیت ہے تو اُس کی نسبت جو علم ہے وُہ بھی ایک شخصی مکاشفہ ہوگا۔ اس کی حیثیت محض ایک مسئلہ کی حیثیت نہیں ہے۔ کوئی اپنے دوست کو اُسی طرح سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا جس طرح کہ اقلیدس کے مسئلہ نمبر ۴ کو سمجھا جاتا ہے۔ ایک دوست مادی حقیقت سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے لیکن خُدا جو ایک مادی حقیقت سے بہت ہی زیادہ ہے اُس کی بابت یہ سوال کہ "وُہ کون ہے"؟ آپ اُسے پُوری طرح نہیں جان سکتے جبتک کہ وُہ خود آپ سے ہم کلام نہ ہو۔ الفاظ، تعلیم، خیالات اور مسئلے جب تک کہ یہ سب کے سب کلام یعنی تجربہ اور رفاقت نہ ہو جائیں، اُس وقت تک مکاشفہ مکمّل نہیں ہوتا یہ مکاشفہ کی وُہ تکمیل ہے جو ہم خُداوند یسُوع مسیح میں پاتے ہیں۔ کشف شدہ خُدا وہی ہے جو مسیح میں ظاہر ہُوا۔ مکاشفہ صرف وُہی نہیں جو کسی کتاب میں مُندرج ہو بلکہ یہ ایک انسانی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کیا اس لحاظ سے یہ زیادہ کامل، زیادہ موزوں اور زیادہ مؤثر مکاشفہ نہیں؟ اہلِ اسلام

جو کہ مکاشفہ کے معاملہ میں ایک کتاب کے تصوّر کے عادی ہو چکے ہیں شاید اس امر کو بخوبی سمجھ سکیں۔ تاہم یہ بات اچھی طرح واضح کر دینی چاہیئے کہ مسیح سے متعلق مسیحیوں کا عقیدہ اُسی نوعیت کا ہے جیسے خدا سے متعلق ایمان کے ذریعے ہم یہ مانتے ہیں کہ خُدا نوعِ انسان کو تاریکی میں نہیں چھوڑتا۔ فرق ان عقائد کے اس تضاد میں ہے کہ وہ اس تاریکی کو مناسب طور پر کس طرح دُور کرتا ہے۔

جب ہم کہتے ہیں "خُدا بیٹا" تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خُدا مکاشفہ کے عمل میں ظاہر ہُوا۔ جب ہم کہتے ہیں BEETH HOVEN موسیقار یا LEONARDO DA VINCI فن کار، تو ان سے ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کی کامل شخصیتوں میں سے چند ایک صلاحیتوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ صلاحیتیں ان کی شخصیتوں میں پُوری طرح موجُود ہیں۔ مسلم ماحول میں خُدا کے بیٹے کی اصطلاح کی تشریح کرتے وقت ہمیں اس بات پہ زور دینا چاہیئے کہ یہ رشتہ جسمانی نہیں ہے۔ مسیحی نقطۂ نظر سے مؤخر الذکر خیال میں بھی نہیں لایا جا سکتا۔ یہ اصطلاح جس کا مطلب ہے کہ مسیح خُدا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ خُدا آپ اپنا انکشاف کرتا ہے۔ اس سے مُراد ایک عمل ہے جو کہ ایک تاریخی شخصیت کا آغاز کرتا ہے اور جس میں کہ خُدا ایک مکاشفی محبّت کی صُورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے مُراد یہ بھی ہے کہ خدا مکاشفے کے عمل میں ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ خُدا سے بیٹا پیدا ہُوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خُدا کی مرضی ایک عمل کی صُورت میں ظاہر ہُوئی۔ سب کچھ اُس کا ہے، اُس کی

طرف سے ہے اور اُس سے ہے۔ خُدا مکاشفہ بھی ہے اور مکاشفہ کی علّت بھی ہے۔ وُہ باپ بھی ہے اور بیٹا بھی۔ اس ایمان سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ جب خُدا خُدا کو ظاہر کرتا ہے تو وُہ جو کچھ بھی ہمیں دیتا ہے وُہ خود آپ ہوتا ہے۔ ہمارا مسیح کی الوہیت میں ایمان جیسا کہ اہل اسلام سمجھتے ہیں خُدا کی بے عزّتی نہیں ہے اور نہ ہی خُدا کی وحدت کے مُنافی۔ ہمارے نزدیک بھی شرک ایک بہُت بھاری گُناہ ہے بلکہ ہمارے ایمان کی بُنیاد اور اس کا منبع یہ ہے کہ ایک زندہ اور ازلی خُدا نے اپنے آپ کو آدمیوں پر ظاہر کرنے کا خود ذمّہ لے لیا۔

۷۔ اب ہم اہل اسلام کے دُوسرے بُنیادی عقیدہ کا جو خُدا کے قادرِ مطلق ہونے سے تعلّق رکھتا ہے ذکر کریں گے کیونکہ ایک مُسلمان کے ذہن میں اس کے متعلّق بھی اعتراضات ہیں اور اس کے متعلّق مسیحی عقیدے کی تشریح لازمی ہے۔ فرض کرو جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خُدا اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے، اگر ایسا ہے تو کیا وُہ اپنا ظہور انسانی شکل میں کرے گا؟ کیا ایسا کرنا اُس کے جلال کے منافی نہ ہوگا؟ مُسلم خیال کے مطابق یہ ایک تضاد ہے اور اس کے مطابق خُدا اور انسان کے درمیان ایک بہُت گہری خلیج ہے۔ یہ سچ ہے کہ ایک گہری خلیج کو پُر کیا جاتا ہے کیونکہ بغیر خلیج کے پُر ہوئے نہ ہی کوئی مذہب اور نہ ہی کوئی مکاشفہ ممکن ہے لیکن خُدا اس خلیج کو درمیانیوں کے ذریعے پُر کرتا ہے یعنی فرشتوں، انبیا اور اُستادوں کے ذریعے سے جن کے وسیلے وُہ اپنا قانون اور اپنی شریعت بنی نوع

انسان کی رہبری کے لیے بھیجتا ہے کیونکہ وہ خود اس خلیج کو اپنے ہی سے پُر نہیں کرتا، وہ خود آنے کی بجائے دوسروں کو بھیجتا ہے۔ ایک مسلمان کے خیال میں خدا کا مسیح میں ہونا اُس کے شایانِ شان نہیں خدا انسان نہیں بن سکتا اگر ایسا ہوتا تو اُس کی الوہیت میں کچھ نا قابلِ تصور چیز پیدا ہو جاتی۔ اہلِ اسلام خود مسیح کی نسبت ایسی تشریح کی ہمیشہ مخالفت کرتے رہے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے وہ خدا کے جلال کا تحفظ کر رہے ہیں۔

جب مسیحیوں کو ایسے تضاد کا سامنا ہوتا ہے تو وہ خدا کے قادرِ مطلق ہونے پر جس کا تحفظ اس طرح کیا جاتا ہے ذرا اگر اسوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیا ہم خدا کو اُن باتوں سے روکنے میں حق بجانب ہیں جن سے وہ اپنے آپ کو روکنا نہیں چاہتا؟ اگر خدا واقعی ہر چیز سے بڑا ہے تو کیا کوئی ایسی بات ہے جو اس لئے نہ کرے گا کہ ہم اُسے سمجھ نہیں سکتے یا چونکہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ نہ کرے؟ کیا ایسا کرنے سے ہم خدا پر قیود عائد نہیں کرتے اور اُس کے قادرِ مطلق ہونے کا ایسا تحفظ کرتے ہیں جسے وہ خود پسند نہیں کرتا؟ یہاں ایسے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کیا بنی نوع انسان کے واسطے حقیقی معنوں میں مکاشفہ خدا کے جلال کے منافی ہے؟ کیا اُسے اپنے مقصد کے منازل کے طے کرنے کا فیصلہ خود نہ کرنے دینا چاہیئے یا ہم کہیں کہ اے خدا تو ایسا نہ کر؟ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو تجسّم یا مکاشفہ کے امکانات کا انکار نہیں کر سکتے۔ اگر تجسّم کے امکانات سے انکار کرنا ممکن نہیں تو اُس کے ظہور کی نسبت پہلے ہی سے دعوؤں کو

ردّ نہیں کیا جا سکتا۔ اِن دعوؤں کو بطور تاریخی شواہد کے پرکھنا لازمی ہے۔ ایسی تحقیق ہمیں انسانی تاریخ میں مسیح تک واپس لے آتی ہے۔

اِن تمام سوالوں کا مُثبت میں لُبِ لُباب یہ ہے کہ اہلِ اسلام جس الہٰی جلال کو بیان کرنے کے خواہشمند ہیں وُہ الٰہی جلال مسیح میں کامل طور پہ کارفرما ہے، جس میں کلام مجسّم ہُوا۔ اگر خُدا انسانی گناہ اور جہالت کی بادشاہت کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتا تو کیا وُہ حقیقی معنوں میں قادرِ مُطلق ہے؟ جب ہم مسئلہ تجسّم پہ اس طرح سوچتے ہیں تو ہمارے خیالات نادیدنی طور پر صلیب کی طرف منہمک ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ انسانی نجات کی خاطر تھا کہ خُدا مجسّم ہُوا۔ جب اہلِ اسلام کے سامنے مسیح کو پیش کرتے ہیں تو دراصل ہم اُن سے خُدا کے قادرِ مطلق ہونے کو زیادہ منواتے ہیں اور اِس طرح اُس کے قادرِ مطلق ہونے میں کوئی کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوتا ہے۔ یہ ماننا کہ خُدا نے ہماری ضرورت اور ہماری کمزوری کو مدِّ نظر رکھتے ہُوئے اپنے آپ کو ہم تک اُتار لیا، اُس کے جلال اور بزرگی میں اضافہ کرنا ہے نہ کہ کمی کرنا ہے۔ ایسی قادریّت پہ ایمان رکھتے ہُوئے ہمیں صبر کے ساتھ لوگوں کو دعوت دینی چاہیئے کہ وُہ مسیح میں ہی اس بات کا ثبوت ڈھونڈیں اور پائیں کہ خُدا واقعی قادرِ مطلق اور ذوالجلال خُدا ہے اور اُسی میں تمام مخالف طاقتیں مفتوح و مغلوب ہو جاتی ہیں۔ اسلام کے لغوی معنی اطاعت اور خُدا کی مرضی کے سامنے جُھک جانے کے ہیں۔ یہ ایسا تعلق ہے جس میں خُدا ہی سب کچھ ہے۔

خُدا کا سب کچھ اور قادرِ مُطلق ہونے کا خلاصہ نئے عہدنامہ میں خُداوند یسوع

ہے ۔ دونوں حالتوں میں قادرِ مطلق ہونا اور اطاعت یکجا باہم ہیں۔ خُداوند مسیح میں الٰہی محبّت کا ظہور اِن تمام چیزوں پر غالب ہے جو انسان کو غلام بنا لیتی ہیں اور ایک مسیحی اُس کی اطاعت قبول کرتا ہے۔ یہ عبادت اور اعتراف کی اطاعت ہے ۔ یہ اُس کا اسلام ہے اور اس کا آغاز بیت اللحم سے شروع ہوتا ہے۔

اہلِ اسلام کی خُدا کے بارے میں ان دو مضامین پہ کہ خُدا مظہر اور قادرِ مطلق ہے، ہماری توجہ صرف کرنے سے یہ مُراد نہیں کہ اسلام میں اور کوئی مقامات نہیں جن سے خُدا کی مسیح میں ظاہر ہونے کی تشریح نہیں ملتی ۔ یہ دو مرکزی مضامین ہیں اور ان کا بیان اعتماد کے ساتھ ضروری ہے ۔ اگرچہ اسلام کے لحاظ سے انسان اور خُدا کا تعلق بُنیادی طور پر شریعت کا ہے لیکن اسلام میں بھی الٰہی رحم اور فضل کا گہرا احساس موجُود ہے ۔ تصوّف میں اس کا بیان شدّت کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ قرآن میں بھی فرمایا گیا ہے کہ مسلمان وُہ لوگ ہیں جن پر خُدا کا فضل ہے نہ کہ وُہ لوگ جن پہ خُدا غضبناک ہے (سورہ ۱:۷) خُدا رحیم ہے جو رحم پسند کرتا ہے اور رحم کرتا بھی ہے اور گذشتہ تمام صدیوں میں بیشمار مسلمان ایسے رحم و کرم کے گریہ و نالہ کرتے ہُوئے خواہاں رہے ہیں ۔ ہم کو خُداوند مسیح میں ایسی خواہشات سے متعلق جو کُچھ بھی ملے، مسلمان سے بیان کرنا چاہیئے اور بتانا چاہیئے کہ شریعت سے پرے معافی ، نئی زندگی اور حقیقی دینداری ہے۔ الٰہی رحم کی نسبت جیساکہ اسلام کا تصوّر بھی ہے ، یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی نسبت پہلے سے کُچھ نہیں کہا جا

سکتا۔ یہ مُفت دیا جاتا ہے اور اسلامی شریعت پر عمل کے مطابق بھی بخشا جاتا ہے لیکن یہ نجات بخشنے والے عمل کی حیثیت نہیں رکھتا، نہ ہی اس کا ظہور ایسے ہمہ گیر واقعات میں پایا جاتا ہے کہ ہم اس کو بخوبی جان سکیں۔ اسلام کے اس عقیدہ میں کہ خُدا رحیم ہے، وثوق اور اطمینان کے مسئلوں کے لئے گنجائش نہیں جن کی بنا پر لوگ کہہ سکیں "ہم جانتے ہیں کہ ہم موت کے ذریعے زندگی میں داخل ہوئے"۔ (یُوحنّا ۱: ۱۴) ۔ہم وہاں یہ کہیں گے "شاید ایسا ہے" یا "ممکن ہے نہ کہ "یہ ضرور ایسے ہی ہے"۔ لہٰذا ہمیں مسیح کو خُدا کے رحم کے مرکز کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیئے۔ بطور ایسے مقام کے جہاں انسانی تاریخ میں خُدا کے رحم کا کام پُورا ہوتا ہے اس کے ذریعے سے جو وعدہ بھی ہے اور اس کے پُورا کرنے کا ذریعہ بھی اور جس کے ذریعے ہم خُدا کو خُدائے بخشندہ اور اپنے آپ کو نجات یافتہ جانتے ہیں۔ یہ وثوق فعالی رحم سے پیدا ہوتا ہے۔ عبث نہیں ہے بلکہ اس وثوق کا پیدا کرنے والا مسیح میں خُود خُدا ہے جو کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ لیکن اگر ہم تجسّم کو خُدا کے دائمی قابلِ انحصار رحم کا نشان تصوّر کریں تو یہ صلیب کا غیر منفک بن جاتا ہے جس کا بیان ہم اب کریں گے۔

صلیب کی تشریح

"نہ وُہ صلیب دیا گیا، نہ ہی وُہ قتل کیا گیا، وُہ سمجھے کہ ایسا ہُوا"۔ (سورۃ نساء ۴ : ۱۵۷) یہ قرآن کا بیان صلیب کے انکار کے بارے میں ہے۔ مسیحی مُفسّر کو اب پھر اپنا جواب ان کے بدیہی انکار سے شروع کرنا ہے لیکن کسی نہ کسی طرح اُن کی مخالفت اور تردید کو تفہیم میں تبدیل کرنا ہے۔

یہ بیان کرنا لازم ہے کہ ذیل میں جو کچھ کہا گیا ہے وُہ مسیحی مذہب کے مسیح مصلُوب کے عقیدہ (خُدا کی نجات بخش طاقت) کے بارے میں مکمّل تفسیر نہیں ہے کیونکہ مکمّل تفسیر کے لئے نہ ہی جگہ ہے اور نہ ہی مکمّل تفسیر پیش کرنا مقصود ہے۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ مُسلم انکار کے مقابلہ میں ہم صلیب کی گواہی کس طرح بہترین طریقہ سے پیش کر سکتے ہیں۔ اس بات کو چنداں بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ صلیب کی حقیقت کا اقرار ہمیں اس اسپرٹ میں کرنا چاہیئے جس میں کہ خُداوند یسُوع مسیح نے اُسے اُٹھایا۔ ہم صلیب برداری ایسے رویے سے نہیں کر سکتے جو رویّہ اگر خُداوند مسیح اختیار کرتا تو پھر صلیب کے اقرار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اگر ہم کہتے ہیں کہ اس نشان میں فتح ہے تو یہ فتح صرف حلم و انکساری کی فتح ہے۔

بہتر ہے کہ صلیب کا بیان کرتے وقت خُداوند یسُوع مسیح کی زندگی

اور بشارت کے اُن واقعات سے آغاز کیا جائے جہاں سے کہ صلیب کا مضمون شروع ہوتا ہے۔ قرآن اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ یہودی مسیح کو مصلوب کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات کہ یہودیوں نے بڑی مخالفت کی اور اُس کی باتوں سے بہت ناراض ہوئے مسلمان اس مخالفت کو نوح سے لے کر حضرت محمدؐ صاحب تک تمام انبیا کا حصہ سمجھتے ہیں۔ قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ خدا کے منکر خدا کے رسولوں کی ہمیشہ مخالفت کرتے آئے ہیں اور خدا ان مخالفین کو ہمیشہ شکست دیتا اور مغلوب کرتا رہا ہے۔ خداوند مسیح کی اُس کے ہمعصروں کی طرف سے مخالفت کے امر کو یاد رکھنا ضروری ہے۔ قرآن اس مخالفت کا پس منظر بیان نہیں کرتا اور خداوند مسیح کی تعلیم کی نسبت گہری خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے۔ کہا گیا ہے کہ مخالفت کی وجہ سے خداوند مسیح کو اُس کے قاتلوں سے بچانے کا انتظام کیا گیا اور اُس کی جگہ یہوداہ اسکریوطی یا کوئی اور شخص جو مسیح کے مشابہ تھا، مصلوب کیا گیا۔ اس طرح اس مخالفت کا پورا خمیازہ مسیح کی بجائے کسی اور شخص کو بھگتنا پڑا۔

آخر ایسے بچاؤ کے لئے الٰہی انتظام پر اعتقاد کیوں ضروری ہے؟ مسیح کو ایسے عجیب و غریب طریقے سے بچانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اس اعتقاد کے محرکات تاریخی نہیں بلکہ عقاید سے متعلق ہیں۔ اہل اسلام کے پاس اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں کہ مسیح موت سے بچ نکلا اور نہ اس کا کہ اُس کی جگہ کوئی دوسرا شخص مقیدہ کر کے مصلوب کیا گیا۔ تاریخ میں کوئی ایسی شہادت

نہیں۔ باوجود اس کے کہ بُہت سے احمدیوں نے اس کے ثبوت کو کشمیر میں ڈھونڈنے کی عبث کوشش کی ہے۔ ایسے بیانات کی وجوہات اور منبع دراصل ایسے مفروضات ہیں کہ انبیاء اور رسُولوں کی مخالفت اُن کے قتل و غارت میں کامیاب نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہو تو الٰہی نظام فیل ہو جاتا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ خُدا اُن کو بچا نہیں سکتا اور نہ ہی اُن کے پیغام کی صداقت پر دلالت کرتا ہے۔ ایسی ناکامی ناقابل تصوّر ہے۔ نوحؑ، ابراہامؑ، مُوسیٰؑ اور داؤدؑ ان تمام نبیوں نے اپنے مخالفین کی شکست کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنی کامیابی کو بھی۔ حضرت محمدؐ صاحب کو اگرچہ ابتدا میں مکّہ کے بُت پرستوں نے ردّ کر دیا لیکن بعد ازاں اُنہوں نے مکّہ کو نہ صرف فتح کیا بلکہ تمام بُتوں کو بھی تباہ کر دیا۔ یہی حال مسیح کا ہے۔ خُدا یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اُس کے خادم ذلّت میں مریں اور نہ ہی اپنے مخالفین کو فتح یاب ہونے دیتا ہے۔ لہٰذا مسیح کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ یہ بالکل قرینِ قیاس اور الٰہی پیغامبر کی حیثیت کے عین مطابق ہے کہ یہُودہ اسکریوتی مسیح کی جگہ مصلُوب ہو۔ یہ اس کے لئے ایک موزوں انجام تھا۔ خُداوند کے لئے ایک موزوں نکتۂ عروج اور یہُودیوں کے لئے بیّن ہزیمت اور شکست۔ ایسا ایمان انجیل کے مفہُوم سے کس قدر دُور اور خُداوند کے بیان "وُہ پیالہ جو باپ نے مُجھے پینے کو دیا" سے کس قدر مُختلف ہے۔

حقیقتاً یہاں ایک ایسی خلیج ہے جس کا آغاز تاریخی شواہد پر نہیں بلکہ عقائد پر مبنی ہے اور یہ خلیج مُفسّر کو عبُور کرنا ہے۔

حال میں ہی ایک مُسلم مُصنّف "انجیل کا مسیح" پر لکھتے وقت جب گتسمنی کے باغ تک پہنچا تو یُوں رقمطراز ہے :۔

"یہاں تاریخی بیان ختم ہوتا ہے اور عقائد کا کردار شروع ہوتا ہے"۔ وُہ یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ خُداوند مسیح کے قید کے بعد کے واقعات تاریخی نہیں بلکہ محض عقائد اور ایمان پر مبنی ہیں لیکن تاریخ بالکل عیاں ہے۔ اگر مسلمان اسے نہ مانیں تو یہ اُن کے مفروضات اور عقائد کی وجہ سے ہے جن کی وجہ سے تاریخ کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور جو انہیں ان باتوں سے باز رکھتے ہیں جنہیں وُہ ماننا نہیں چاہتے۔

اُوپر بیان کیا گیا ہے کہ خُداوند کی مخالفت تھی مگر اس مخالفت کا نکتۂ عُروج جو کہ صلیبی موت ہے ایک بعد کی من گھڑت کہانی ہے (جیسا کہ یہ ہوسکتا ہے اگر صلیب حقیقت نہ ہو) تو کیا کلیسیا نے اس ایمان کو خود گھڑا تھا جو ایمان اس کلیسیا کے معرض وجُود میں آنے کی وجہ تھا؟ اور کیا کلیسیا نے محض ایک تاریخی واقعہ گھڑ لیا ہے؟ اور کیا یہ ایمان اس من گھڑت تاریخ کا نتیجہ ہے؟ تو کیا تاریخی کلیسیا جس کا ذکر اسلام بھی کرتا ہے محض خُداوند مسیح کی تعلیم پر مشتمل تھی؟ کیا مسیح کے شاگرد محض ایک مسیحی اخلاقیات کے مبشر تھے؟ اور کیا وُہ "موت میں سے زندگی" کے مبشر اور علمبردار نہ تھے؟ تو پھر پاک عشاء میں ابتدا ہی سے اِن دُکھوں کی یاد کیوں منائی جاتی ہے جن کا کوئی وجُود ہی نہیں ہے؟ کیونکہ ہفتے کا پہلا دن یعنی اتوار جو کہ مسیح کی قیامت کا تیسرا دن تھا مسیحیوں کا سبت ہوگیا؟ کیا

تاریخی کلیسیا کی مکمل تشریح و تفسیر ہم متبادل مصلوب کے مفروضہ کی بنا پر کر سکتے ہیں؟

لیکن اصل معاملہ اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ تاریخی کلیسیا کا آغاز جو صلیب کے بعد کی قیامت پر ایمان لانے سے ہُوا اس کی تشریح و تفسیر کے علاوہ ایک اَور اہم مسئلہ ہے جو ہمیں تاریخ سے دُور خُدا کی اُس تصویر کی طرف لے جاتا ہے جہاں سے صلیب کے متعلق مسلم تصانیف کا جواز نکلتا ہے۔ ایسے خُدا کی ذات و ماہیت کے متعلق ہم کیا کہیں جو ایسے فعل کا مرتکب ہوتا ہے یا ایسے مسیح کے اخلاق کی نسبت جو ایک دُوسرے شخص کو (خواہ وُہ یہوداہ اسکریوتی ہی کیوں نہ ہو) بلاوجہ خمیازہ بھگتنے دے جبکہ یہ مخالفت خود اُس کی اپنی ہی تعلیم کا نتیجہ ہو۔ کیا اس قسم کی فتح خُدا کے پیامبر کے شایانِ شان ہے؟ مخالفت تو ہے اَور مسلمان بھی مانتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس مخالفت میں خُدا کا کردار کیا ہے اَور مسیح کا کردار کیا؟

اس کا بیّن جواب یہ ہے کہ وُہ دُکھ اُٹھاتا ہے۔ اہلِ اسلام کی تشریح اناجیل کی اس تمام تعلیم کے سراسر منافی ہے جس میں خداوند مسیح کے ایثار اَور قربانی کا ذکر ہے۔ یہ خُداوند مسیح کے دُکھ سہنے کے متعلق آگاہی، احساس اَور اُس کے اس نہ ٹلنے والی ضرورت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کے بھی مخالف ہے۔ خُداوند مسیح نے فرمایا تھا:۔ "کہ ضرور ہے کہ ابنِ آدم دُکھ اُٹھائے۔" ابتدا سے آخر تک خواہ وُہ بیابان میں تھا یا سڑک پر یا گتسمنی باغ میں یا صلیب پر اُس نے دُکھوں اَور موت سے بچنے کی کوشش

نہ کی یعنی یروشلیم کو خیرباد کہنے یا صلیب سے اُتر آنے کی آزمائش
کا ہمیشہ مقابلہ کیا۔ قرآنی تشریح نے اِن تمام تاریخی آزمائشوں کو
تبدیل کر دیا ہے بلکہ بالکل معدُوم کر دیا ہے اور ان کی جگہ آسان
راہ کے اختیار کا بیان کیا ہے بلکہ اس پر اور بے انصافی یہ کی ہے
کہ مسیح کی بجائے یہوداہ بطور بدل کے پیش کر دیا ہے، اس طرح اس
تشریح نے خُداوند یسُوع مسیح کی تعلیم اور اُس کے دُکھوں کے درمیان
جو ظاہراطور پر ربط اور تسلسل ہے اُس کو بُری طرح مجرُوح کر
کر دیا ہے اور اس طرح نادانستہ طور پر اس نے پیامبر کو نہ مان کر
اُس کے پیغام کو ردّ کر دیا ہے۔ چُونکہ اسلام نے مسیح کو اپنے تصوّر کے
مطابق ایک کامیاب پیغمبر پیش کرنے کی کوشش کی ہے لہٰذا ایسا کرنے
سے اُس نے مسیح سے اُس کی تمام صفات اور خُوبیاں چھین لی ہیں
اور اُس کو اس طرح پیش کیا ہے کہ مسیح پہچانا بھی نہیں جاتا۔ اسلام کا
کہنا ہے کہ ایک شخص بالکل مسیح کی شکل کا تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے
کہ خود مسیح کو بھی اُس کی اپنی شکل پر نہیں رہنے دیا۔ اناجیل کا مسیح
اس مبہم اور دُھندلے مسیح سے بالکل مختلف ہے جس نے اپنی تعلیم
کی راہ خود ترک کر دی اور جس نے اپنا اسلام خود چھوڑ دیا یعنی جس
نے خُدا کے ازلی ارادے سے مُنہ موڑ لیا۔ سچ مچ اس اسلامی صلیب
پر ہم پُکار اُٹھتے ہیں اور کہتے ہیں جیسے کہ کہا بھی گیا ہے "وہ جانتے
نہیں کہ کیا کرتے ہیں"۔ یہ نہ صرف رُومی سپاہیوں پر صادق آتا ہے
بلکہ ایسے تمام فلسفیوں اور دُوسرے مُفکروں پر بھی جو یسُوع کو موت سے بچائے رکھنا چاہتے
ہیں ۔

خُدا کے کردار کی نسبت کیا بیان ہو سکتا ہے؟ اسلامی صلیب کا
خُدا جس کے مطابق دُکھ اُٹھانے کے لئے مسیح کی بجائے بدل ڈھونڈ لیا گیا،
ایک ایسا خُدا ہے جو دُشمنوں کا تختہ اُلٹ دیتا ہے اور ایک راہِ فرار پیدا
کر دیتا ہے اور اس طرح اپنے دُشمنوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔
ایسا خُدا جو دُکھ اُٹھا کر اور محبت کے ذریعے سے دُشمنوں کو نہیں جیتتا بلکہ
ایک آمرانہ بیان اور فرمان کے ذریعے سے۔ تاہم اس بات کو یاد رکھنا
ضروری ہے کہ اہلِ اسلام نے صلیب کا بیان جس طرح کیا ہے وہ خُدا
کے جلال کی خاطر ہے۔ اِن کا کہنا ہے کہ اگر ایک نبی کے غنیم اُس پر فتح
حاصل کریں تو اس طرح یہ فتح خُدا کے لئے باعثِ توہین ہے۔ یہ بات
ناقابلِ تصوّر ہے کہ خُدا اپنے نبی اور خادم کو اہلِ یہود جیسے لوگوں سے نہ
چُھڑائے۔ سو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سی بات زیادہ الٰہی ذات
کے مطابق ہے اور کونسی بات اُس کے جلال کے عین مطابق۔ حقیقت
میں ہم یہ پُوچھ سکتے ہیں کہ کونسی بات خُدا کو خُدا بناتی ہے اور کونسی
بات جلال کو بطور جلال ظاہر کرتی ہے۔ خُدا کے اوصاف کیا ہیں؟
مسلمانوں کا صلیب کے متعلق یہ رویّہ ایسے مسائل پیدا کر دیتا ہے
شاید اگر ابتدا میں ہم اس مسئلے کی تشریح کریں تو بہتر ہے اور باقی
مسائل کو جُوں کا توں رہنے دیں کیونکہ اس نقطہ سے آگے بحث
نامناسب ہے۔ ہمارے پاس صرف سادہ شواہد اور یقین ہے جس
کو ہم جبراً ٹھونس نہیں سکتے بلکہ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کریں کہ "خُدا
نے مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دُنیا کا میل ملاپ کر لیا۔" (۲-کرنتھیوں ۵: ۱۹)
بحث و مناظرہ کے علاوہ تشریح میں اور کیا ہونا چاہیے؟ صلیب

ہمیں کیسے بچاتی ہے؟ قیامت سے کیا مُراد ہے؟ خُدا مسیح میں کیسے موجود تھا؟ یہاں مسیح مصلوب پر ایمان کے تمام گواہوں کو اپنی نجات کے شخصی تجربہ کی بنا پر ہی گواہی دینا ہے۔ ہمیں بتانا ہے کہ صلیب کی تبلیغ نے ہماری اپنی زندگیوں میں کیا کیا ہے اور ہمیں اس طاقت اور اطمینان کا اعلان کرنا ہے جو بے شمار لوگوں نے مسیح میں ایمان کی بدولت دریافت کیا ہے۔ یہاں جان بنین کا مسیحی کا سفر جس نے اپنا تمام بوجھ صلیب پر لاد دیا، ایک اہم مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جس کا ذکر صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ یہ حقیقت بیان کرنے کے لئے مختلف محاورات والفاظ استعمال کئے گئے ہیں جیسا کہ نئے عہد نامہ میں تلمیحات سے ظاہر ہے مثلاً غلامی سے مخلصی، گناہ سے چھٹکارا، تاریکی کا روشن ہونا، بدی سے رہائی، دشمنی سے نجات وغیرہ وغیرہ۔ الفاظ اور زبان خواہ کوئی ہو بہرحال یکساں اور یک زبان اعتراف صلیب کو بطور تبادلہ گاہ کے نشان وہی کرتا ہے۔ ہمارا کام مسیح مصلوب کی اس طاقت کی گواہی دینا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کی زندگیاں تبدیل ہوتی ہیں جس کی وجہ سے گناہ کا پیچھا چھوڑا جاتا ہے اور خود غرض زندگی کو آزاد کر کے خُدا اور انسان کی خدمت کے لئے وقف کیا جاتا ہے۔ ہر مسیحی تحریک اور مہم کے پیچھے، بے شمار بے غرض اور ایثار والی تبلیغی زندگیوں کے پیچھے خواہ وُہ زندگیاں گمنام ہوں، مشہور مسیح کی صلیب کی خُوشنما اور مجبور کرنے والی طاقت ہے۔ اہلِ اسلام کو بھی دُوسرے لوگوں کے ساتھ اس گواہی میں شامل ہونا چاہیئے۔ اب یہ سوال کہ مسیح کیسے بچاتا ہے، اس کا جواب صرف شخصی تجربے سے ہی دیا جا سکتا ہے۔

تاہم اہلِ اسلام حق بجانب ہیں اگر وُہ اس بات کی بے لوث تشریح طلب کریں کہ مسیح کی صلیب کا انسانی چلن اور زندگی کے نتائج سے کیا تعلق ہے؟ اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں اُسے اسی جگہ واپس لانا پڑے گا جہاں سے ہم نے ابتدا کی تھی۔ یعنی بدی کی مخالفت جس کا اعتراف اسلام بھی کرتا ہے لیکن اس کو نقطۂ عروج سے محروم کر دیتا ہے۔ مسیحی تاریخ کا یقین ہے کہ مسیح نے اس مخالفت کی وجہ سے حد تک دُکھ اُٹھایا اور اُس نے یہ دُکھ خوشی سے برداشت کیا کیونکہ یہ دُکھ سہنا اُس کے اپنے پیغام سے وفاداری کی قیمت تھی۔ یروشلیم ان تمام بُرائیوں اور تعصبات کا مرکز تھا جن کو مسیح نے اپنی تعلیم اور پیغام میں نشانہ بنایا ہُوا تھا تو پھر وُہ ان سے بے تعلق کیوں کر رہ سکتا تھا؟ مسیح نے گلیل کے محفوظ ماحول میں رہنے سے انکار کر کے یروشلیم کی راہ اختیار کی لیکن یروشلیم کا رُخ بہت مہنگا تھا۔ چنانچہ اُس نے فرمایا "دیکھو ہم یروشلیم کو جاتے ہیں اور جتنی باتیں نبیوں کی معرفت لکھی گئی ہیں، ابنِ آدم کے حق میں پُوری ہوں گی"۔ (لُوقا ۱۸: ۳۱)

خُداوند مسیح نے اس آخری اور مکمل جنگ کا مقابلہ کیا اور اس مقابلے میں وُہ اپنے پیغام اور مسائل سے پُورا پُورا وفادار رہا یعنی اُس نے بُرائی کے عوض بُرائی نہ کی اور نہ ہی نفرت کا مقابلہ عیاری اور نفرت سے کیا۔ ایسے مقابلہ سے صرف صلیب ہی پیدا ہو سکتی ہے چُونکہ مسیح نے کوئی جارحانہ قدم نہ اُٹھایا اور نہ ہی طاقت کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی اپنے آپ کو بادشاہ بنایا تو ایسے مقابلہ کا نتیجہ سوا صلیب کے اور کیا ہو سکتا تھا یا تو وُہ اپنی گواہی کو واپس لے لیگا یا اُس کے

نتائج بھگتے گا یا وہ اُن نتائج کا مقابلہ صرف ایسے عمل سے کرے گا جو مقابلہ کرنے والے کے لئے کھلا ہے یا صرف دُکھ اُٹھاکر برداشت کرے گا۔ عمل کے یہ دونوں راستے مسیح کے دماغ میں صاف طور سے عیاں تھے جیساکہ اناجیل کے مطالعہ سے ظاہر ہے لیکن اُس نے برداشت اور دُکھ سہنا مناسب جانا۔ بطور واقعہ کے صلیب کوئی بناوٹ یا مصنوعی سکیم نہیں ہے۔ یہ ایک حقیقت کا مظہر ہے جس کا اظہار اُس وقت ہوتا ہے جب مسیحی محبت کا مقابلہ یروشلیم جیسی دُنیا سے ہوتا ہے۔

یہاں یروشلیم بطور اصل نمونہ کے ہے۔ صلیب کا کتبہ عبرانی، یونانی اور لاطینی میں لکھا ہُوا تھا۔ یہ فعل جہاں تک انسانی تھا اُن انسانی طاقتوں کا نتیجہ تھا جو تمام انسانیت میں مشترک ہیں۔ تمام بنی نوع انسان کے گناہ اور تاریکی کے اشتراک سے خداوند مسیح کی صلیب کا کام تمام ہُوا۔ پلاطوس میں سیاسی اور ذاتی تحفظ اور آرام کے گناہ تھے اور مذہبی شان و تکبر کے گناہ جو سردار کاہنوں میں تھے اور عوام کے استبداد اور باہمی رضامندی کے سماجی گناہ، یہ تمام اس بڑے کام کی تکمیل کے لئے ضروری تھے۔ یہ صلیب کی نمائندہ خاصیت ہے جو تمام بیان میں نمایاں ہے۔ ہم پلاطوس، یہوداہ اسکریوتی اور کائفا کو اپنے اور دُوسرے آدمیوں کے دلوں میں پہچانتے ہیں۔ اگرچہ یہ واقعہ فلسطین میں ہُوا لیکن یہ خاصیت تمام دُنیا کی ہے۔ گورنر اور سپاہی خواہ رُومی تھے اور مسیح کے مجرم ٹھہرانے والے خواہ یہودی

تھے لیکن یہ تمام اپنی گمراہی میں انسانیت کا نمونہ تھے۔ صلیب کو سمجھنے کے لئے ہمیں تاریخی واقعات سے ابتدا کرنی چاہیئے اور اس واقعہ سے ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ تمام انسان اپنے گناہ اور بدکاری میں اسی طرح کرتے ہیں۔ صلیب کی نجات بخش خاصیت میں شرکت کرنے سے پیشتر ہمیں اس کے ساتھ انسانی مکاشفہ میں شامل ہونا پڑے گا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہمیں اس بات کا پتہ چلے گا کہ ہم کس قسم کے انسان ہیں اور ہمارے ساتھ دوسرے بنی نوع انسان کس قسم کے ہیں۔

لیکن صلیب اگر اس طرح آدمیوں کا فعل تھا تو یہ مسیح کا فعل بھی تھا۔ اس نے آدمیوں کے بدترین سلوک کے پیش نظر کیا کیا؟ جس راہ کا اس نے آزادی کے ساتھ انتخاب کیا تھا اس سے کمال وفاداری کے ساتھ اس نے صلیب کا دُکھ اُٹھایا اور اپنے خلاف گنہگاروں کے تضاد کو اپنی زبان اور دل سے معاف کرتے ہوئے برداشت کیا۔ اس معافی سے معافی پیدا ہوتی ہے۔ اگر خداوند مسیح غیظ و غضب کی حالت میں یا خاموشی کی حالت میں جان دے دیتے تو دُنیا کی نجات کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ منجی صرف برداشت کے ذریعے تمام دُنیا کے گناہوں کو اُٹھائے جاتا ہے۔ صلیب کے کلمات ہرگز نہ کہے جاتے، اگر خداوند مسیح پت ملی ہوئی مے سے مخمور اور مدہوش ہو جاتے۔ یہ کلمات خداوند مسیح کے جذبات کی باطنی طبعیت کا اظہار کرتے ہیں اور صلیب کو نجات کے ارفع ترین عمل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ حقیقتاً ہم اُس کے مار کھانے سے شفا پاتے ہیں۔ یہاں ہمیں محبت کی ایک ایسی نوع دکھائی دیتی ہے جو بدی کا قلع قمع کرتی ہے کیونکہ

یہ اس کے تمام نتائج آزادی کے ساتھ اپنے اُوپر لے لیتی ہے۔ انتقام اُور نفرت سے بَدی جڑ پکڑتی ہے لیکن مُعافی اُور برداشت کے ذریعے سے بَدی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ وُہ جو اُس میں شامل ہونے کے لئے اقرار کرتے ہیں اُن کے لئے ایک نئی مخلصی اُور نئی نجات کا آغاز ہوتا ہے جہاں پرانی چیزیں جاتی رہتی ہیں۔

علم الٰہی کے دقیق بیانات صلیب کے اس مفہُوم کو سمجھانے میں کہ مسیح کا یہ فعل نجات بخش ہے ہمیشہ قاصر رہیں گے۔ ہمیں لوگوں کو صرف اس کی کاملیت کی راہ پر لانا ہے۔ خُداوند مسیح کے دُکھوں کی شان کو بیان کرنا نہایت ضرُوری ہے۔ اُس کے ایثار اُور یروشلیم تک جانے کا بیان لازمی ہے۔ اگرچہ اُسے فرار کے مواقع حاصل تھے لیکن اُس نے راہِ فرار سے انکار کیا۔ اُس کا دُعا میں مشغُول رہنا، فرار سے اس کا اجتناب جبکہ یہوداہ اسکریُوتی اس کی گرفتاری کے لئے ایک جم غفیر جمع کر رہا تھا، پلاطُوس کے سامنے اُس کی اُس وقت خاموشی جبکہ اُس کی زبان سے چند ایک الفاظ لوگوں کو پلاطُوس کے خلاف کر سکتے تھے اُس کا صبر کے ساتھ ناقابل گریز مصیبت کو برداشت کرنا محبّت کی قیمت تھی۔ ان تمام باتوں کا مسیح کی سرگذشت میں مقام ہے صلیب کوئی ایسا خیال نہ تھا جسے بعد میں سوچا گیا ہو، نہ وُہ کوئی ایسا المیہ تھا جو دفعتہً ظہُور پذیر ہُوا ہو۔ یہ مسیح کا سوچا سمجھا ہُوا عمل تھا جو اُس نے خُوشی سے انتخاب کیا۔ یہ عمل مسیح نے اپنے مشن اُور پیغام کے ساتھ دُنیا اُور تمام انسانیت کے گناہوں کے لئے اختیار کیا۔ جب مسیح میں یہ تمام باتیں پُوری ہُوئیں تو اس طرح تمام دُنیا کے لئے نجات

پیدا ہوئی۔ اگر صلیب آدمیوں کے کردار کو ظاہر کرتی ہے تو یہ مسیح کی ذات اور طبیعت کا بھی مظہر ہے۔ اس نکتۂ عروج سے اجتناب اور مسیح کو صلیب سے دُور رکھنا اور صلیب کو مسیح کے پاس نہ آنے دینا اس سے ہم مسیح کو خُود اُس صلیب سے علیحدہ کر دیتے ہیں جس کے ساتھ اُس نے اپنے آپ کو ہمیشہ پیوستہ رکھا۔

صلیب کی بابت مسیحیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ صلیب اور مسیح ہمیشہ روزِ ازل ہی سے الٰہی مقصد کے مطابق اور مسیح کی تابعداری سے باہم پیوستہ تھے۔ اگرچہ صلیب کو آدمیوں کا اور مسیح کا فعل سمجھا جا سکتا ہے تو بھی مسیحیت میں اس کو خُدا کا فعل سمجھنا بھی ایک ناگزیر بات ہے۔ "خُدا مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دُنیا کا میل ملاپ کر رہا تھا۔" (۲۔کرنتھیوں ۵: ۱۹) مسیح کی صلیب میں فرماں برداری سے خُدا کی مرضی پُوری ہوتی ہے۔ یہ تمام باتیں خُدا کی محبّت میں پائی جاتی ہیں۔ اگر صلیب کو اس طرح سمجھا جائے تو پھر اُن غلط نظریوں کا امکان نہیں، جن کی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسیح صلیب پر خُدا کو راضی کر رہا تھا، گویا کہ خُدا کو آدمیوں کے مُعاف کرنے سے کسی محبّت کی ضرورت تھی۔ نہیں مسیح کو دُکھ اُٹھانے سے گنہگار انسان کی طرف خُدا کی محبّت کا ازل ہی سے اظہار ہوتا ہے کیونکہ ہر بدی کے مقام میں محبّت کو دُکھ سہنا ہوتا ہے۔ بڑے بڑے انبیاء نے اس حقیقت کو صاف صاف دیکھا تھا۔ یرمیاہ نے اس حقیقت کو خود اپنی زندگی میں محسوس کیا۔ یسعیاہ نبی کی کتاب میں جس بڑے دُکھ اُٹھانے والے کا ذکر ہے اُس کی

نسبت ان الفاظ میں ذِکر ہے "اُس کو ہماری بدکرداریوں کی وجہ سے گھائل کیا گیا" وُہ دُکھ اُٹھانے والا بھی ایک عوض اَور بدل تھا کیونکہ اُسی نے اپنی اُمّت کے تمام گناہوں غموں اَور دُکھوں کو اپنے اُوپر لے لیا۔ جس ایثار اَور محبت کے ساتھ اُس نے دُکھ اُٹھایا، وُہ خُدا کی ذات کے عین مطابق تھا، اس لئے اُس کی نسبت یُوں لکھا ہے۔

"خُدا نے ہم سب کی بدکرداری اُس پر لا دی" (یسعیاہ ۵۳: ۶) خُدا کو بُدی کا بہت فکر ہے۔ یہ بات کہ خُدا کو بدی کا کتنا فکر ہے، ہمارے قیاس سے باہر ہے۔ بُدی کا خُدا کی پاکیزگی اَور اُس کے رحم سے تعلق ہے۔ خُدا ہر اُس مقام میں موجُود ہے جہاں بُدی کا تدارک محبت کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ انسان کی گمراہی سے متعلق الٰہی فکر مسیح میں صلیب پر ظاہر ہے اَور اس ایک فعل کے ذریعے سے وُہ بُدی کے تمام نتائج کا تدارک کرتا ہے اَور فعل ایک عالمگیر حیثیت سے تکمیل پاتا ہے۔ "دیکھو یہ خُدا کا برّہ ہے جو دُنیا کا گُناہ اُٹھا لے جاتا ہے" (یُوحنّا ۱: ۲۹) یہاں خُدا کا رحم دُکھ کے ذریعے دُنیا کی مُعافی کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچاتا ہے اَور یہ ایک الٰہی ذات کی ضرورت ہے۔ وُہ تمام لوگ جنہوں نے اس حقیقت کو بیان کرنا چاہا، الفاظ اَور زبان کے افلاس کی وجہ سے اس حقیقت کو صحیح بیان کرنے سے قاصر رہے اَور آخر اُنہوں نے اس عبارت کا سہارا لے کر اس حقیقت کو بیان کیا "خُدا مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دُنیا کا میل ملاپ کر رہا تھا" بالآخر صلیب وُہ فعل ہے جو خُدا کرتا ہے اَور جو کچھ لوگوں نے وہاں کیا، اُس کا جواب ہے اَور مسیح نے جو کُچھ کیا اس ذریعے سے خُدا نے

اپنا ارادہ پُورا کیا۔ چنانچہ صلیب کی نسبت جتنی بھی تبلیغ ہے وُہ آدمیوں کے باطنی افعال اَور مسیح کے فعل کے مفہوم کا اعلان اَور مظہر ہے ۔ یہ خُدا کے فعل کے مفہوم کا مظہر بھی ہے جہاں ایک ہی واقعہ میں تمام جہان اَور تمام وقت کے لئے گناہ کی اصلیت اَور فضل کی فتح کا اظہار ہوتا ہے۔

۵۔ پاک رُوح کی ہدایت کے ماتحت مسلمانوں تک صلیب کا یہ کلام ہم اَور کس طرح پہنچا سکتے ہیں؟ صلیب کے بیان کی طاقت کے ذریعے اَور پُرانے عہد نامہ کے نبیوں کے دُکھ اُٹھانے کی تشریح کے ذریعے جن کو اسلام نے بالکل طاقِ نسیاں پر رکھ چھوڑا ہے اَور اسلام کے اس نظریہ کے ذریعے بھی کہ آخرکار معافی نہ صرف انتقام سے بہتر ہے بلکہ اس سے مشکل بھی ہے۔ ہمیں یہ بات اصرار سے کہنی چاہیئے کہ یہ خیال کرنا حقیقت سے بعید ہے کہ اگر کوئی آدمی دُوسرے کی خاطر دُکھ اُٹھائے تو یہ ایک غیر اخلاقی بات ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے اَور جب ہم اپنے آپ کو اُس کی طاقت کے تابع کر دیتے ہیں اَور ان شرائط کے مطابق چلتے ہیں تو ہم گناہ سے مخلصی پاتے ہیں۔ ہم میں مختلف ارادوں کے باہمی ٹکراؤ کی وجہ سے جو فضول خیال پیدا ہوتے ہیں اُن کو دل سے نکال دینا چاہیئے۔ کیا اگر یہوداہ اسکریوتی نہ پکڑواتا اَور پلاطُوس بُزدلی نہ دکھاتا تو پھر صلیب بھی نہ ہوتی؟ کیا یہوداہ اسکریوتی کی بے وفائی اَور پلاطُوس کی بُزدلی دُنیا کی نجات کے لئے لازمی ہے؟ ایسے خیالات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ہم اس واقعہ یا تمام واقعات کے درمیان باہمی ارادوں کے تعلق کو نہیں سمجھتے۔ صلیب کا تعلق گناہ سے ہے۔

گناہ ایک حالت پیدا کرتا ہے اور اس حالت میں محبت جو کچھ کرتی ہے وہ صرف محبت ہی کا خاصہ ہے۔ یہ کہنا ہرگز مناسب نہیں ہوگا کہ اگر مکہ میں کفار اور بت پرست نہ ہوتے تو اسلام کا آغاز ہی نہ ہوتا۔

اسلام کے اکثر طبقات میں قربانی کی بابت بڑے دور رس خیالات اور نظریے موجود ہیں۔ اہل شیعہ خصوصاً مانتے ہیں کہ اگر دُکھ کو معصومیت کے ساتھ برداشت کیا جائے تو یہ بات نہ صرف خدا کے نزدیک مقبول ہے بلکہ الٰہی قدرت کا ثبوت بھی ہے۔ اس طرح حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ اور حسینؓ کا ذکر مسیحیوں کی صلیب کے احساس کی تشریح میں کافی ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ اہل شیعہ کے نزدیک کربلا کا المیہ جس میں حضرت حسینؓ اور اُن کے تمام پیروکار بیدردی سے قتل کر دیئے گئے ایک عمداً اور دیدہ دانستہ کفارہ تھی۔ مسلمانوں کے گناہوں کے لئے حضرت حسینؓ اپنے خون کے بہائے جانے کے باعث اپنے لوگوں کے لئے کفارہ سمجھے جاتے ہیں اور اُن کا موت کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ایک ایسا امر ہے جو دلوں میں گہری عقیدت پیدا کرتا ہے۔

صلیب کی تشریح کے لئے یہ معاونات ہیں لیکن صلیب کے نظیر نہیں ہو سکتے۔ صلیب کو خود اُس کی اپنی روشنی میں دیکھنے کے لئے منتظر رہنا بہتر ہے۔ بالفاظِ دیگر صلیب کو سمجھنے کا راز اس کے تضاد میں ہے۔ اہل تصوف اور شیعہ کو چھوڑ کر تمام اسلام میں یہ مسلمہ امر ہے کہ الٰہی کام بالآخر غالب اور فتح مند ہوتا ہے۔ مسلّم

مصنّفین کا خیال ہے کہ اسلام کی ابتدائی جنگیں اسلام کی بقا کے لئے ضروری تھیں۔ اگر ان جنگوں کو نہ لڑا جاتا تو نوزائیدہ عقیدہ تباہ ہوجاتا۔ اس سے یہ عیاں ہے کہ پیغمبر اسلام کے ہاتھ سے اور اُن کے نام سے طاقت کا استعمال جائز اور روا ہے۔ لہٰذا مسلمان مکّہ میں جو پہلے ہی مُنہ کے بل گرا ہُوا تھا، فاتحانہ داخل ہُوئے اور اس فتح سے اُنہوں نے وہاں کے قبائل کی اطاعت حاصل کی لیکن یسوُع نے یروشلیم میں فتح کی بیرونی علامات کو قبوُل کرنے سے انکار کیا۔ بیرونی فتوُحات اُس کے لئے ممکن تھیں لیکن اُس نے اُن کو ردّ کر کے صلیب کی راہ اختیار کی۔ وُہ لوگ جو صلیب کے مفہوم کو سمجھنا چاہتے ہیں اُن کو یہ تضاد سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ تضاد بہُت ہی نمایاں ہے کیونکہ یسُوع کی یروشلیم کی حیثیت اور حضرت محمدؐ صاحب کی مکّہ کی حیثیت یکساں تھی۔ دونوں کو مذہبی حقیقت کی وجہ سے عزّو مرتبہ پر مبنی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ دونوں کو مخلوق میں حقیر اور سماج دُشمن سمجھ کر ردّ کیا گیا۔ فریسی اور قریشی اگرچہ دُوسری باتوں میں بہُت مختلف ہیں لیکن اس بات میں ملتے جُلتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن میں کوئی بات یکساں نہیں۔ یسُوع نے یروشلیم کو فتح نہ کیا۔ اُس نے اُس کی دیواروں کے باہر دُکھ اُٹھایا۔ صلیب اُس کا تخت بن گئی۔ یہ ضروری ہے کہ اس فرق کو نہایت احتیاط اور بغیر نکتہ چینی کے بیان کیا جائے۔ جبتک یہ بات سمجھی نہ جائے گی، اس وقت تک یہ بات بھی سمجھی نہیں جا سکتی کہ صلیب آسمان کی بادشاہت کی

چابی ہے۔ بہت سے مسلم مسیح کو اُس کے انتخاب کی وجہ سے قابلِ رحم قرار دیتے ہیں لیکن ایسے مسلم خال خال ہیں اور بہت ہی کم ہوتے اگر مسیحی لوگ صلیب کی راہ کو چھوڑ کر جبر و استبداد اختیار نہ کرتے۔ صلیب اپنی طاقت کی وجہ سے آج تک لوگوں کے دلوں کیلئے مقناطیسی کشش رکھتی ہے۔ اگر مسیحیت کے مختلف نمونے پیش کئے جائیں تو یاد رہے کہ گو جبر و استبداد والا نمونہ کڑی تنقید سے محفوظ نہیں رہ سکتا لیکن بالآخر یہ صلیب والا مسیح ہے جس کی پیروی اور عقیدت کے لئے ہم لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ ہر مذہب کو پہلے اس کے بانی کی زندگی کی روشنی میں سمجھنا چاہیئے، پیشتر اس کے کہ اس کا جائزہ اس کے مقلدین کی زندگی سے لیا جائے۔

لہٰذا کلیسیا کی زندگی کا راز اسی لفظ "صلیب" میں ہے۔ یہ بعض لوگوں کے نزدیک ہمیشہ ٹھوکر کا باعث اور بیوقوفی رہے گی۔ بغیر رُوح القدس کی مدد کے صلیب ہمیں خُدا کی مُعافی اور رحم کا مرجع نظر نہیں آسکتی اور نہ ہی یہ ہمیں بطور الٰہی رحم کے جو لوگوں کی نئی مخلوق کے لئے فعّال ہے، نظر آسکتی ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم تحمل اور عقلمندی کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو روشن کرنیوالے (رُوح القدس) کا ذریعہ بنیں کیونکہ صرف رُوح القدس ہی ایک ایسا ذریعہ اور روشنی ہے جس کے طفیل لوگ مسیح کو اپنا مُنجی اور پیار کرنے والا جان سکتے ہیں جس نے ان کی خاطر دُکھ اُٹھایا۔

"کیا اُس کے سر پر بادشاہوں جیسا تاج ہے۔ بیشک اُس کے سر پہ تاج ہے لیکن خاردار۔"

قیامت جو خداوند یسوع مسیح کی نظر میں اور کلیسیا کے ایمان میں صلیب کا جزو لاینفک ہے اس کی بابت ہم کیا کہیں؟ اسلام کے نزدیک قیامت ابھی آنے والی حقیقت ہے۔ قرآن میں جب مسیح اپنی موت کا بیان کرتا ہے تو یہ مستقبل کی طرف اشارہ ہے۔ مسیح نہ مؤا اور صلیب کے بغیر کوئی فتح نہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس بات کی تشریح کریں کہ قیامت مسیح اُس کی موت کی خاصیّت و نوعیّت کا ایک ضروری نتیجہ ہے۔ یہ واقعہ ایک بدیہی اہمیّت رکھتا ہے اور یہ اُس محبّت کا ثبوت اور اظہار ہے جس کی وجہ سے مسیح مؤا اور قیامت کا واقعہ مسیح کی کامل اور جامع فتح کا ثبوت بھی ہے اور دُکھ اُٹھانے والے کی ذات اور شخصیّت کا اظہار بھی ہے۔ اُس کی قیامت اُس کی موت کی نوعیّت کی وجہ سے ہے۔ قیامت ایک واقعہ کا خود ساختہ آخری منظر نہیں جو کسی دُوسری حالت میں مختلف ہوتا۔ اس میں مسیح مصلوب کی حقیقی اور ذاتی فتح مُضمر ہے، اور اس فتح میں انسان کی نجات کی مُہر ہے جو ہمیشہ کی زندگی کے دروازے اس پر کھول دیتی ہے۔ یہ جلال کے بادشاہ کا اپنے جلال میں ظاہر ہونا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وُہ محبّت کا بادشاہ ہے، لہٰذا مسیح اور قیامت ایک رسُولی انجیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بہُت سے تاریخی امُور کو اس بیان میں شامل کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ کلیسیا کی تخلیق محض ایک ہونے والی قیامت کے قیاس پر مبنی نہیں، اگرچہ تاریخی امُور نہایت ضروری

ہیں تاہم مشارح کا ضروری فرض صلیب کی تشریح ہے جہاں ہماری توجہ مرکوز رہی ہے۔ کیا شاگردوں کو اسی سبب سے یقین نہ آیا کہ یسُوع جی اُٹھا ہے اور اُنہوں نے کیلوں کے نشان اُس کے ہاتھوں اور پاؤں میں دیکھے ؟ صلیب کو درگزر کرنا ایسٹر کے ناآشنا ہونے کے مترادف ہے۔ خالی قبر والے باغ کو راستہ رنج و الم کے باغ سے ہی جاتا ہے۔ اگر ہم اہلِ اسلام کو ابدی زندگی کے دروازہ کے قریب لانا چاہتے ہیں تو ہمیں اُن کو واپس اسی پُرآشوب راہ پر لے جانا پڑے گا۔

---

(۵) مسیحی نظریۂ خُدا کی تشریح

۱۴۔ بیسویں سورت کی ۲۷، اور ۲۸ آیت میں ایک دُعا ہے۔ یہ دُعا ان مسیحیوں کے لئے بھی نہایت موزوں ہے جو اہلِ اسلام کے سامنے مسیحی نظریۂ خُدا پیش کرنا چاہتے ہیں۔ دُعا یوں ہے :۔

"اَے خُدا میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وُہ میرے کلام کو سمجھ سکیں"۔

کیونکہ اس معاملہ میں بہت سی باتیں ہیں جو اہلِ اسلام کے لئے گراں بار ہیں یعنی مسیحی بیان بہت مُشکل ہے۔

ایک لحاظ سے اس بیان میں ہم مسیحی نظریۂ خُدا کی تشریح پہلے کر چُکے ہیں کیونکہ خُدا کی بابت نظریات کی تشریح کئے بغیر مسیح کی شخصیت کی تشریح، مسیحی کُتب اَور صلیب کی تشریح اور ان پر بحث ناممکن ہے اگرچہ یہ حقیقت ہے تاہم ان مضامین کی علم الٰہیات کے لحاظ سے جو اہمیت ہے ان کو یکجا جمع کرنا ضروری ہے اَور یہ بھی ضروری ہے کہ انہیں مختصراً اَور مسلمان رویہ کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہُوئے بیان کیا جائے۔ ایسا کرتے وقت دیگر اہم نکات کی تشریح بھی ضروری ہے۔

دراصل علم الٰہیات کی یہی حقیقت ہے، جس کی وجہ سے ہم نے نظریۂ خُدا کی بحث کو التوا میں رکھا۔ مؤذن جب مُسلم کو دعوتِ نماز دیتا ہے تو خُدا کی وحدانیت کا اعلان کرتا ہے اَور یہ اعلان سب عقیدے کا منبع ہے۔ یہاں اس پر اکتفا کریں اَور اس کا

بیان دُوسرے مضامین کے بعد ہو۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خُدا مقدّم اَور سب سے افضل نہیں اَور سب چیزوں کا منبع نہیں۔ ہمارا ایسا کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسیحیّت خُدا کی کاملیت کو ہمیشہ اعمال اَور تاریخ کے سیاق و سباق میں سمجھتی ہے۔ لہٰذا ان چیزوں پر غور و خوض کرنا یقیناً خُدا پر غور و خوض کرنے کے برابر ہے۔ ہمارا یہ طریقِ بیان خُدا کو دُوسرا مقام نہیں دیتا۔ ہم شخصی تجربہ سے ابتدا کرتے ہیں اَور پھر یہاں سے رفاقت اَور فضل حاصل کرتے ہُوئے ایمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ سلسلۂ اشیاء میں خُدا سب سے مقدّم ہے لیکن سلسلۂ علم میں خُدا کا مکمل اَور پُورا علم حاصل کرنے سے پہلے دُوسری چیزوں کا علم مقدّم ہے۔ وُہ اس تمام علم کا منبع ہے جو اُس کی ذات سے متعلق ہے لیکن اس علم کے اندر اُس کی ذات نکتۂ عرُوج ہے۔ ہمارا علم اُس ذات سے متعلق ہے جو ازلی اَور اَبدی ہے۔ جب کبھی ہم خُدا کی ذات سے متعلق علم پر بحث کرتے ہیں تو ہم پہلے خُدا کے کام سے جو اُس نے کئے، شرُوع کرتے ہیں اَور پھر ہم اُس کی ذات پر بحث کرتے ہیں۔ مُسلّم شہادت کا نظریہ بھی خُدا کا بیان کرتے وقت پہلے غلط اَور ابتدائی نظریات کی تردید سے شرُوع ہوتا ہے۔ کوئی نظریہ کبھی خلا میں شرُوع نہیں ہوتا۔ نئے عہدنامہ کا بیان عبرانی پس منظر سے شرُوع ہوتا ہے اَور اسی طرح عقائد نئے عہدنامہ کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں۔

لہٰذا جب ہم مسیحی نظریۂ خُدا پر بحث کرتے ہیں تو پہلے ہم مسیح اَور اناجیل سے متعلق اپنے مفروضات کی تحقیق کرتے ہیں۔ ابتدا میں دو بڑی

غلط فہمیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلی غلط فہمی سادگی کے معیار کے غلط استعمال سے متعلق ہے اور دوسری غلط اصطلاحات ہیں۔

یہ عام خیال ہے اور اکثر کہا بھی جاتا ہے کہ خدا کے متعلق مسیحی نظریہ غیر ضروری طور پر پیچیدہ، دقیق اور مبہم ہے جیسا کہ ایک نقاد نے کہا ہے "باپ ناقابلِ فہم، بیٹا ناقابلِ فہم اور روح القدس ناقابلِ فہم، تمام کا تمام نظریہ ناقابلِ فہم" اکثر کہا جاتا ہے کہ مسیحیوں کا خدا کے متعلق ایمان ناقابلِ فہم ہے۔ یہ اپنی ہی پیچیدگی کے باعث منہدم ہو جاتا ہے۔ زمانۂ حال کے اسلامی ادب میں یہ خیال اکثر اوقات ظاہر کیا گیا ہے۔ اکثر مغربی اصحاب جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے خواہ وہ عرب کے ایچ۔ سینٹ جان فلبی کی طرح سیاح ہوں یا مغرب میں احمدیہ مشن کے مرید، یہ سب مسیحی مذہب کی نسبت یہی فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مسیحی مذہب کو اس کے مرکزی عقائد کے دقیق اور پیچیدہ ہونے کے باعث سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اسلام زود فہم اور آسان ہے۔ محمد علی نے اپنی کتاب "میری سوانح عمری کا ایک ٹکڑا" میں کہا ہے کہ جہاں تک علم الہیات کا تعلق ہے، اسلام کی تمام تھیالوجی ڈاک کے صرف ایک ٹکٹ پر لکھی جا سکتی ہے۔

"لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہ"

یہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے ان کے فکر و یقین پر کوئی زیادہ بوجھ نہیں پڑتا۔

اِن نظریات کے پیشِ نظر مسیحیوں کے لئے اس بات کی تشریح

کرنا ضروری ہے کہ خدا کے متعلق مسیحی نظریہ صرف پیچیدگی کی خاطر ہی پیچیدہ نہیں اور نہ ہی اس کے عقائد اور نتائج مصنوعی اور غیر ضروری ہیں۔ یہاں ہمیں سادگی کے معیار پر بھی غور و خوض کرنا لازمی ہے۔ مشہور فلسفی اے۔ این وائٹ ہیڈ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اکثر سادہ حل بودا حل ہوتا ہے۔ اس کی نسبت خواہ آپ کی کوئی رائے ہو لیکن جتنا مضمون زیادہ بلند ہوگا، اس کا حل اتنا ہی زیادہ ادق اور پیچیدہ ہوگا۔ اس امر سے بھی انکار نہیں کہ سادہ اور غیر عالم لوگ بھی خدا کو جان سکتے ہیں اور نہ ہی اس امر کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات ایسے لوگ فلسفی اور مفکّر قسم کے لوگوں کی نسبت خدا کے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں نہ ہی اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات مذہبی پیشوا اور مذہبی عالم دوسرے عالموں کی طرح علم الٰہیات کے حصول میں والہانہ گرفتار ہو جاتے ہیں۔ یہ مقام علم الٰہیات کی مذہب سے متعلق اہمیت پر بحث کرنے کا نہیں۔ اگرچہ اسلام بھی اس بات کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا لیکن ہم اس بات کا تکرار ضروری سمجھتے ہیں کہ خدا سے متعلق نظریات کا محاسبہ یا جائزہ محض سادگی کی بنا پر موزوں اور مناسب نہیں۔ اگر اس نظریہ کی تشریح نہ کی جائے تو یہ گمراہی پیدا کر سکتا ہے۔

اس طرح کے سادہ بیانات مثلاً خدا ایک ہے یا خدا محبت ہے، اس لحاظ سے سادہ ہیں کہ یہاں مبتدا اور خبر

آسان الفاظ ہیں اور یہاں دوسرے پیچیدہ جملے نہیں ہیں تاہم سادہ بیانات میں ایسی گہرائی اور پختگی بھی ہوتی ہے جیسے کوئی چھپا نہیں سکتا لیکن سادگی کا مطالبہ بعض اوقات غیر ضرورۃً طور پر اس لئے خطرناک ہوتا ہے کہ ایسے مطالبہ سے فکر و نظر معطل ہو جاتے ہیں یا ان کا قطعی انکار کیا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کا ہر حالت میں مقابلہ کرنا چاہیئے۔ صرف تھوڑی سی سوچ بچار سے واضح ہو جاتا ہے کہ خدا سے متعلق نظریات کی خوبی اس بات میں نہیں کہ ہم ان نظریات کو ڈاک کے ٹکٹ پہ بیان کر سکتے ہیں۔ اصطلاحات کی تعریف کا جائزہ یا محاسبہ اعداد و شمار پہ مبنی نہیں ہونا چاہیئے یا عددی نہیں ہونا چاہیئے۔

اس نکتے کی تشریح نہایت ضروری ہے۔ ایک اینٹ کی تعریف سادہ ہو سکتی ہے اور چونکہ یہ تعریف سادہ ہوگی لہٰذا مختصر بھی ہوگی لیکن خدا کی تعریف گو مختصر ہو سکتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ مختصر ہونے کے باعث سادہ اور زود فہم یا درست ہو۔ سادگی اس لحاظ سے ایک مبہم اور غیر متعارف خوبی ہے، لہٰذا اسے ایک صحت مند تھیالوجی کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس حقیقت پر اصرار کرنے سے یہ مقصد نہیں کہ علم الٰہیات کے ماہرین نے کبھی تھکاوٹ پیدا کرنے والی طوالت سے کام نہیں لیا اور نہ ہی یہ کہ مسیحی نظریہ کی تشریح کرتے وقت کبھی بھی ناگندہ پن واقع نہیں ہوا۔ اس بحث کا مُدعا فقط یہ ہے کہ اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو مسیحی نظریۂ تثلیث، الٰہی علم اور

شخصی تجربے کا بیان ہے اور اس رُوحانی حقیقت کو صرف اسی ایک طریقہ سے محفوظ اور جاری رکھا جا سکتا ہے۔ کارلائل CARLYLE کے ساتھ اُس کے اس مذاق میں شریک ہونا آسان ہے کہ مسیحی دُنیا مسیح کی تعریف کرتے وقت لفظی زیروبم کی وجہ سے مُنقسم ہوگئی لیکن اس تمام جھگڑے کو صبر و تحمل سے سمجھنا ایک عالمانہ رویہ ہے۔ کوئی کلیسیا یا مذہب اس حقیقت میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا جس حقیقت کو وُہ بیان کرنے سے قاصر ہے۔

لہٰذا ہم مسیحیوں کا ایک فرض یہ ہے کہ ہم اس غلط فہمی کو صبر و تحمل کے ساتھ رفع کریں کہ مسیحی علم الٰہی، غیر ضروری اور دقیق ہے جس نے سچے خُدا سے متعلق سادہ علم کو خواہ مخواہ اور دقیق بنا دیا ہے۔ یہ ضرُوری ہے کہ مسلمانوں کو ان کی اپنی سادگیوں کی گہرائی سے آگاہ کیا جائے جن مسیحی نظریوں کو وُہ غیر ضرُوری سمجھتے ہیں اُن کی ضرُورت اور اہمیت سے بھی اُنہیں آگاہ کیا جائے۔ خُدا سے متعلق مختلف نظریات کا مقابلہ سادگی کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان نظریات کا موضوع واقعی خُدا ہے تو ایسا بالکل نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے سامنے صرف یہ سوال ہونا چاہیئے کہ سادگیِ بیان کس قدر واضح اور صاف ہے ؟ بالفاظِ دیگر یہ نظریہ کس قدر عمیق اور پختہ ہے ؟

یہاں سے دُوسرا مسئلہ شرُوع ہوتا ہے یعنی اصطلاحات کی نسبت غلط فہمی۔ مسیحی لوگوں کا تثلیث میں (یعنی باپ، بیٹا اور رُوح القُدس) ایمان کسی طرح بھی خُدا کی وحدت کی تردید نہیں کرتا۔ تثلیث

خُدا کی وحدت کو سمجھنے کا ایک طریقہ ہے، نہ صرف سمجھنے کا بلکہ اس وحدت کو محفوظ رکھنے کا۔ مُسلمانوں کے ساتھ کلام کرتے وقت شاید ہمارا سب سے بڑا فرض یہی ہے کہ اس کی تشریح کی جائے۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق باپ، بیٹے اور رُوح القُدس کی تثلیث خُدا کی وحدت کے منافی ہے لیکن مسیحی عقیدہ کے مطابق تثلیث خُدا کی وحدت کی تشریح کرتی ہے۔ مُسلمان مسئلۂ تثلیث کو مسئلہ وحدت کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن مسیحی تثلیث اور وحدت کو نہ صرف مطابق خیال کرتے ہیں بلکہ لازم وملزوم سمجھتے ہیں۔ مسیحی ایمان کے مطابق جھگڑا تثلیث اور وحدت کا نہیں بلکہ تثلیث و دہریت کا ہے۔ اس راز و نشر کی دُنیا میں مسیحی مذہب کا خُدا کے متعلق ایمان صرف اسی طرح بیان کیا جا سکتا ہے اور یہ ممکن بھی ایسے ہی ہے۔ بعد کی تشریح کا موضُوع یہی دعویٰ ہوگا اور اُمید ہے کہ اس دعویٰ کو ہم کماحقہٗ برقرار رکھیں گے لیکن ہم یہ بھی بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ فلسفی یا تاریخی نُکتۂ نگاہ خُدا سے متعلق مسیحی نظریۂ خُدا کی مکمل تشریح ممکن نہیں۔ اگر ہمارا مقصد مُسلمانوں کے لئے اس ایمان کی تشریح کرنا ہے تو ہمیں اس استدعا سے ابتدا کرنا پڑے گی کہ مُسلمان مسیحی نظریۂ تثلیث کو وحدت کے منافی سمجھنے کی بجائے اسے وحدت کے بیان کی قسم سمجھ کر اس پر غور وفکر کریں۔ جب تک ہم دونوں پہلے اس بات پہ اتفاق نہ کریں کہ ہم دونوں خُدا کی وحدت کے تسلیم کرنے میں یکساں اور پکے ہیں، اُس وقت تک ہم بحث کو جاری نہیں رکھ سکتے۔ ہم دونوں عبرانی روایت میں بدستور قائم

ہیں یعنی۔ خداوند ہمارا خدا صرف ایک ہی خدا ہے"۔ ہماری بحث کا موضوع ایک خدا ہے کہ تین خدا۔ مسیحیت کا تعلق فقط ایک خدا سے ہے۔ جو مسلمان تین خدا کے موضوع پر بحث کرتے ہیں وہ حقیقت میں مسیحیت پر بحث نہیں کرتے۔ ہمارا اختلاف صرف خدا کی وحدت کی تشریح اور تعریف میں ہے اس کے علاوہ جو بھی بحث ہو اس کا مسیحیت سے کوئی تعلق نہیں۔

اس موضوع کو جاری رکھنے سے پیشتر یہ بیان کرنا موزوں ہے کہ خدا سے متعلق مناظرہ نامناسب اور غیر موزوں ہے۔ اگر یہ بحث نظریاتی تعصب، مناظرہ اور جھگڑے کی صورت میں کی جائے تو یہ غیر اسلامی بھی ہے اور غیر مسیحی بھی۔ ہمارا کام یہ نہیں کہ بحث میں فتح یاب ہوں بلکہ ہمارا کام اذہان کو یکجا کرنا ہے جہاں دلیل کی ضرورت ہو، وہاں ہمیں تشریح اور وضاحت سے کام لینا چاہیئے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم یقین اور وثوق کا اظہار بھی کریں، تاہم یہ بات عیاں ہے کہ خدا سے متعلق خیالات آپس میں ٹکرانے نہیں چاہئیں۔ جہاں کہیں خدا سے متعلق بحث میں ایسا جھگڑا پایا جائے ہمیں ایوب کی ملامت یاد رکھنی چاہیئے (ایوب ۳۸: ۲) "یہ کون ہے جو نادانی کی باتوں سے مصلحت پر پردہ ڈالتا رہے گا۔ ہمارا مقصد محبت اور عالمانہ گفتگو کے ساتھ اس کامل ایمان کا اظہار کرنا ہے جس کے مطابق ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہماری استدعا اور معذرت کو ہمارے ایمان کی روشنی میں سمجھنا چاہیئے اور اس کو بگاڑ کر مضحکہ نہیں اڑانا چاہیئے۔ ....

ہمیں صبر کے ساتھ اصل ایمان اور بگاڑے ہوئے ایمان میں تمیز کرنی چاہیئے اور یہ ہرگز فرض نہیں کرنا چاہیئے کہ تمام مباحثے مصنوعی ہیں، لہٰذا ان کو خیرباد کہا جا سکتا ہے ۔ اگر ہم خُدا سے متعلق ان مباحثوں سے گریز کریں یا اُن کے بارے میں خاموشی برتیں تو ان کا سامنا ہمیں کسی اور جگہ کرنا پڑے گا۔ ہمیں یہ وہم دِل سے نکال دینا چاہیئے کہ خاموشی کی سازش امن قائم کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم جب بھی ایسا کلام یا گفتگو کر رہے ہیں تو ہمارا موضوع خُدا ہے تو پھر مسیحی لوگ باپ، بیٹا اور رُوح القدس (جو کہ ایک خُدا ہے) کو کیوں مانتے ہیں؟ اس ایمان سے کیا مراد ہے؟ اس بات کا جواب مختصراً دیا جا سکتا ہے۔ خُدا سے متعلق مسیحی نظریہ کے دو مکتبِ فکر ہیں، ایک تجرباتی ابتدا اور دُوسرا مسئلہ ہیئت۔

جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں، خُدا کی نسبت علم اُس کے کاموں کے تجربے سے ہوتا ہے۔ کسی شخصیت کا سُراغ عمل اور تعلق سے ملتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ نظریۂ تثلیث خُدا کے کاموں کا خلاصہ ہے کیونکہ یہ اُن سے بہت زیادہ ہے۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ فعّال خُدا کی ہستی اور اُس کی ذات کا مظہر ہے۔ خُدا کے متعلق اس ترقی پذیر احساس کی حقیقت جس سے اس کا تعلق انسان کے ساتھ سمجھا جاتا ہے، پہلے پہل اِن لوگوں نے محسوس کی جو خُدا کی وحدت میں ایسا ہی پکا اعتقاد رکھتے تھے جیسا کہ مسلمان رکھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا مکّہ کی بُت پرستی کے خلاف احتجاج بھی عبرانی

اور مسیحی روایت کی ایک صدائے بازگشت تھی۔ حضرت محمدؐ صاحب کی بُت شکنی عرب کے حالات میں موزُوں بھی تھی اور ضرُوری بھی، لیکن مسیحی عقائد کی تردید کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ یہ عقائد کسی حالت میں بھی بُت پرستی نہیں کہے جا سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیحیوں نے بھی اپنے آباواجداد اور اپنی صدی کے حالات میں بالکل ویسی ہی بغاوت کی تھی جیسی کہ حضرت محمدؐ نے ملک عرب میں۔

لہٰذا جب رسُول اور مذہبی پیشوا تاریخی ایمان میں اپنے مسیحی تجربے کا بیان کر رہے تھے تو وُہ ایسا کرتے وقت خُداؤں کی تعداد میں اضافہ نہیں کر رہے تھے۔ حضرت محمدؐ صاحب کی طرح اُنہوں نے بھی خُدا، اللہ، قادرِ مُطلق، خالق اور رازق سے ابتدا کی جو نہ صرف حکوُمت کرتا ہے بلکہ اپنے بندوں پر ظاہر بھی ہوتا ہے۔ اُنہیں پتہ تھا کہ تمام جہان خُدا کی تخلیقی قُدرت سے پیدا ہُوا ہے۔ جہان کی پیدائش کی نسبت اُن کا یہ نظریہ تھا کہ آفرینشِ جہان اور اس کے بعد بھی دُنیا کے لمحہ بہ لمحہ معرضِ وجُود میں آنے کا باعث خُدا تعالیٰ کی آزاد اور ذمہ دار مرضی ہے۔ وُہ مانتے تھے کہ خُدا تعالیٰ کی خواہش ہے کہ انسانی رُوح اُس کی پرستش اور اطاعت کرے۔ اور وُہ یہ بھی مانتے تھے کہ خُدا کی مرضی میں انسان کی خُوشی اور بھلائی کا راز مُضمر ہے۔ وُہ مانتے تھے کہ انسانی زندگی الٰہی قانون کے ماتحت ہے اور وُہ یہ بھی مانتے تھے کہ یہ قانون خُدا تعالےٰ نے ایک قوم کے سپُرد کیا ہے اور وُہ قوم خُود وہی لوگ تھے جن کا فرض اس قانون پر عمل کرنا اور دُوسروں کو بتانا تھا کہ یہ تمام نوعِ

انسان کے لئے حقیقت ہے۔ اِن تمام نکات میں وُہ بالکل اسلام
سے ملتے تھے جو حضرت محمدؐ صاحب نے نئے سرے سے بطور نئی
حقیقت کے پیش کئے۔ یہ سچ ہے کہ وُہ ابھی خُدا کو باپ کہہ کر پکارنا
نہیں سیکھے تھے لیکن وُہ خُدا کو قادرِ مُطلق، شریعت کا دینے والا اور
رحیم مانتے تھے۔ اُن کی عبادت اور تعلیم سے خُدا کے قادر ہونے پر
ایمان ظاہر ہوتا تھا اور اُن کی یہ اُمید آرزو یہ تھی کہ خُدا عدل اور
رحم کو قائم کرنے کے لئے دُنیا کی تاریخ میں خُود دخل دے گا۔
ان ہی حالات میں مسیحی مذہب کی نشو و نما ہُوئی۔ خُداوند یسُوع
مسیح کی تعلیم میں بھی بُنیادی نظریہ یہی تھا اور وُہ مسیحی عُلمائے دین
جو نئے عہد نامہ کے مُصنّف تھے یا زمانہ مابعد کے، اُن سب کے
لئے یہ نظریہ ایک مسلّمہ حقیقت تھا۔ اس نُکتہ سے ہم سب سے
زیادہ پُر مطلب آیت تک پہنچ جاتے ہیں جس میں یُوں لکھا ہے۔
"تم خُدا پر ایمان رکھتے ہو مجھ پر بھی ایمان رکھو۔" (یُوحنّا ۱۴: ۱)
یُونانی میں یہ فعل (رکھو) یا تو خبر ہے یا امر۔ ضرُوری بات یہ ہے
کہ خُدا میں ایمان اور مسیح میں ایمان کے درمیان بڑا گہرا تعلّق ہے۔
یہ تعلّق کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ خُدا کی ذات، مسیح کی شخصیت
اور اس کے مشن سے کیوں مشابہ ہے؟ مسیح کی حقیقت کو سمجھنا
اور خُدا کو کامل طور پر سمجھنا کیوں لازم و ملزُوم ہیں؟

اس کے دو جواب ہیں۔ خُدا اپنی ذات کی وجہ سے ظاہر
ہونے والا ہے۔ چُونکہ وُہ ظاہر ہونے والا خُدا ہے اور چُونکہ وُہ
اس ارادے میں پاک اور رحیم ہے لہٰذا اُس کے ارادے میں

آدمیوں کی نجات بھی ہے۔ مسیحی صحیفوں کا ذکر کرتے وقت ہم نے اس مسیحی اور اسلامی عقیدے کا ذکر کیا تھا کہ دونوں کے مطابق خُدا اپنے تئیں مکاشفہ اور الہام کی صُورت میں ظاہر کرتا ہے اور وُہ ایسا اس لئے کرتا ہے کیونکہ اُس کا اپنے لوگوں کے ساتھ تعلّق شریعت اور محبّت پر مبنی ہے۔ وُہ اپنے لوگوں کو گمراہی اور بے علمی میں رہنے نہیں دیتا اور اُن پر اپنی مرضی، اپنا ارادہ اور اپنی ذات کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ مسیحیوں کے نزدیک ایسا مکاشفہ بالآخر شخصی ہی ہو سکتا ہے اور اس کا لُبِ لُباب لفظِ کلام میں ہے جو ہم میں رہتا ہے۔ ہمارے درمیان چلتا پھرتا ہے اور ہم انسانوں کے علم اور پہچان کے لئے ہمارے درمیان موجُود رہتا ہے۔ دیگر اگر یہ مکاشفہ زندہ خُدا کا ہے تو اس میں رفاقت کا ارادہ بھی پایا جائے گا جو صرف یہ ہی نہیں بتائے گا کہ وُہ کیا ہے۔ بلکہ یہ بھی دکھائے گا کہ وُہ کون ہے۔ مکاشفہ خُدا کو ہمارے نزدیک اور ہمیں خُدا کے نزدیک لائے گا اور اس طرح خُدا اور ہمارے درمیان رفاقت اور ربط پیدا ہو گا۔ شریعت کا مقصد ہے کہ ہم اطاعت قبُول کریں اور الہام اور مکاشفہ کا مقصد ہے کہ ہمیں معرفت حاصل ہو۔ خُدا کی ذات محض خیال نہیں ہے اور اس کو صرف خیال کے طور پر نہ ہی مانا اور سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی اطاعت کی جا سکتی ہے۔ مسلمانوں اور مسیحیوں دونوں کے نزدیک خُدا کی ذات انسانی اطاعت وعبادت کا مطالبہ کرتی ہے اور انسان سے رفاقت بھی پیدا کرنا چاہتی

ہے۔ الہام صرف تاریکی کو دُور نہیں کرتا بلکہ خُدا اَور انسان کے درمیان جو فاصلہ ہے اُسے بھی دُور کرتا ہے۔

اس نُکتہ پر خُدا سے متعلق مسیحی نقطۂ نظر کو گناہ کے مسئلہ سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ شریعت کو توڑا جاتا ہے اَور انسان کی سرکشی کی وجہ سے خُدا کے الہام کا مقصد پُورا نہیں ہوتا۔ دُنیا اپنی تمام تاریخ میں خُدا اَور نیکی کی مخالف رہی ہے۔ یہ مضمُون خُدا سے متعلق انجیلی مکاشفہ میں مربُوط ہے جہاں انسان کی کج روی کے مکاشفہ کا ذِکر بھی آتا ہے۔ ایسی المناک حقیقت کے امکان میں رفاقت کا امکان بھی پایا جاتا ہے۔ اگر اس میں الٰہی نیکی کے خلاف بغاوت کرنے کی اہلیّت نہ ہوتی تو انسان کبھی بھی اس نیکی کے ردِّ عمل کے قابل نہ ہوتا جو اُسے الہام اَور مکاشفہ میں ملتی ہے۔ حقیقی محبّت اَور حقیقی اطاعت جبر سے حاصل نہیں کی جا سکتی لہٰذا مسیحیّت مکاشفہ کی رُو سے بھی اَور انسانی کردار کے لحاظ سے بھی انسان میں گناہ کا امکان دیکھتی ہے۔ مزید برآں مسیحیّت گناہ کی عملی حقیقت کو بھی جانتی ہے اَور یہ جاننا چاہتی ہے کہ خُدا جو کہ مُطلق نیکی ہے اُس کا ردِّ عمل انسانی گمراہی کے پیشِ نظر کیا ہے؟ اس کا جواب اسے مسیح میں ملتا ہے۔ مسیحیت یہ سمجھتی ہے کہ انسانی سرکشی، نافرمانبرداری اَور غیر اصلاحیّت جو کہ انسانی تواریخ میں ایک حقیقت ہے، اسے بمعہ اسلام دُنیا کے تمام مذاہب کو ماننا چاہیئے۔

اہلِ اسلام کے فکر کے لئے شاید یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اگر مسیحی اس بات کو مانتے ہیں کہ انسان کو سرکشی اور گناہ کے لئے مکمل آزادی ہے تو ان کا یہ خیال کسی طرح بھی خُدا کی نیکی کے بارے میں اُس کی مطلق العنانی کے مُنافی نہیں ہے مُسلمان علمائے دین کا انسانی اور الٰہی مرضی کے مابین تعلق اور رشتہ کی بابت جو فکر ہے ہم پہلے بھی اس کا بیان کر چُکے ہیں۔ یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ انسان کی خُدا کے خلاف سرکشی کی حقیقی لیکن محدُود آزادی اگرچہ تاریخی امُور اور حقائق کی تشریح میں مدد دیتی ہے تو بھی یہ کسی طرح بھی خُدا کی قادریّت یا وحدت کے مُنافی نہیں۔ جہاں تک کہ انسان کی مرضی پر اور اس کے حالات پر اُس کی قُدرت اور مرضی کا تعلق ہے، انسان کی سرکشی کی آزادی خُدا کے فضل اور مکاشفہ کے عظیم مقصد میں موجُود ہے۔

گناہ کا آغاز معلُوم کرنے سے گناہ کا علاج زیادہ ضرُوری ہے۔ اگر انسان ایک سرکش اور نافرمانبردار مخلوق ہے تو شریعت جو الہام کے ذریعے بھیجی گئی اور خُدا کے ارادے کا پیمانہ اور مظہر ہے اس کی کیا حیثیت ہے؟ کیا خُدا کی اس مرضی اور ارادے کی ہمیشہ فرمانبرداری ہوتی رہے گی؟ کیا الہامی مقصد کو انسان کی شرعی اور اخلاقی نافرمانبرداری کا خیال نہ رکھنا چاہیئے؟ کیا نجات کے انتظام کے بغیر خُدا، قادرِ مُطلق رہ سکتا ہے؟ کیا سرکش انسان کو اس کی سرکشی کے ذریعے شریعت کی نیکی کی محبت اور رفاقت نہ لانا چاہیئے؟ جو اس کی زندگی کا مقصد اور اس

کی سب سے بڑی مشکل ہے۔ مسیحا ہونے کے کُلّی معنی یہی ہیں کہ
خُدا خُود تاریخ میں داخل ہو جاتا ہے تاکہ انسان کو سیدھے راستے
پر لگائے اَور اس کی راستبازی کی شریعت کے شکستہ مقاصد
کو از سرِ نَو حیات بخشے۔ جب تک دُرستگی کا انتظار رہا اس کے
معیار کی نسبت مختلف تصوّرات غالب تھے لیکن جب مسیح آیا تو
اُس نے ان تصوّرات کو پُورا کیا اَور یکسر نئی صورت بخشی تو پھر
اس کا مطلب دُکھ اُٹھانا اَور کانٹوں کا تاج ٹھہرا۔ مسیحی مذہب
میں خُدا سے متعلّق سب سے زیادہ تعمیری نظریہ یہی ہے کہ مسیح
نے بطور منجی ممسوح کے جنم لیا، تعلیم دی، دُکھ اُٹھایا اَور پھر
مر گیا۔

مسیح کی قیامت کے بعد کے لوگ اپنے مسیحی تجربے کی الہٰی
اہمیّت کو سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے اُس کے اس دعویٰ کی صداقت
کو معلُوم کر لیا "جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا" (یُوحنّا
۱۴: ۹) اُن کے لئے صرف یہی حقیقت کافی تھی جس کے ذریعے
وُہ اپنے اس تجربے کو بیان کر سکتے تھے کہ مسیح اُن کے لئے کیا
حقیقت رکھتا ہے۔ چنانچہ وُہ مسیح سے متعلّق اپنے تجربے کو یُوں
بیان کرتے ہیں "کلام مجسّم ہُوا، ابنِ آدم اَور خُدا کا بیٹا، نجات
کا بانی اَور کامل کرنے والا وغیرہ وغیرہ"۔ یہ الفاظ مُشرکوں کی
زبان میں نہیں پائے جائیں گے۔ نہ ہی یہ لوگ بُت پرست
تھے۔ یہ محض خُدا سے متعلّق ایک عمیق اَور گہرے تجربے کا
نتیجہ تھا۔ ایک واحد خُدا پہ ایمان رکھنے والوں کی حیثیت سے

اُن کے لئے کوئی اَور طریقہ بیان نہیں تھا جس سے وُہ حقیقت کا اظہار کرتے کہ مسیح نے اُن کے لئے اَور تمام دُنیا کے لئے کیا کیا ہے۔ اس عقیدے کی وجہ سے خُدا میں یا اُس کی وحدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہُوئی بلکہ اس عقیدے سے خُدا اَور اُس کی وحدت اَور زیادہ راسخ ہوتی ہے کیونکہ اس طرح گناہ اَور نافرمانبرداری جن کی وجہ سے پہلے خُدا کا مقصد ناکام اَور اُس کی شریعت توڑی جاتی تھی اَور جو اپنی غلط اَور دائم حالت میں نیکی اَور خُدا کے خلاف ایک مخالف طاقت کی حیثیت رکھتے تھے اب اس طرح مغلُوب کئے گئے کہ پہلے کوئی شریعت اس گناہ اَور نافرمانبرداری کو مغلُوب نہیں کر سکتی تھی۔ مسیح نے اس عمل کی بنا پر ایک خُدا کو ماننے والے یہُودیوں کو کہا تھا کہ "تم خُدا پر ایمان رکھتے ہو مُجھ پر بھی ایمان رکھو" کیا ہم جو ایک خُدائے مُطلق اَور افضل پر ایمان رکھتے ہیں بغیر یہ مانے کہ "خُدا مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ میل ملاپ کر رہا تھا" ایسا ایمان رکھ سکتے ہیں؟

مندرجہ بالا حقیقت ہمارے ذہن میں اُس وقت ہوتی ہے جب ہم تثلیث کی بابت مسیحی عقیدہ کے تجرباتی منبع کا ذکر کرتے ہیں لیکن ہمارا تجربہ اس سے بھی آگے بڑھا۔ یہ ایک اَور حقیقت کا سرچشمہ تھا اس ایمان کی وجہ سے آدمیوں میں ایک نئی رفاقت پیدا ہو گئی۔ اس کی وجہ سے گواہی اَور اقرار کی نئی ذمّہ داریاں پیدا ہو گئیں۔ یہ نئی خُوشی، نئے اطمینان اَور نئی طاقت کا ایک موقع تھا۔ مسیح کے صلیب پر نجات کے کام کا یہ دُوسرا حصّہ تھا جو لوگوں میں

اور رُوحوں میں نجات کا کام کر رہا تھا۔ وُہ نیکی جو شریعت کروانا چاہتی تھی اب ایک شخصی مسرت کی حیثیت اختیار کر گئی۔ انسان محسُوس کرنے لگے کہ وُہ اب ایک نئی صُورت میں ڈھلتے چلے جا رہے ہیں۔ معافی کی وجہ سے ایک نئی خُوشی اور نئے فرض کا احساس پیدا ہو گیا۔ لوگوں کے دِلوں میں ایک اخلاقی طاقت پیدا ہو گئی اور دُنیا میں ایک نمایاں کیفیت ظہُور پذیر ہُوئی۔ اس کیفیت کا نام رُوح القُدس کی رفاقت ہے۔ یہ مسیح کی زمینی زندگی کے ساتھ ایسا وابستہ تھا کہ لوگ اس حالت اور کیفیت کو بھی اُسی مسیح کی طرف منسوب کرنے لگے۔ یہ صریحاً الٰہی چیز تھی؛ لہٰذا اس کو ایسا ہی سمجھا جانے لگا۔ خُوشی اور فہم کا یہ نیا ظہُور اتنا ہی الٰہی عمل تھا جتنا کہ خُداوند مسیح کی تعلیم اور اُس کا تکلیف اُٹھانا۔ خُدا انسان کے اُوپر تخلیقی قُدرت رکھتا ہے اور اس کے لئے نجات بخش محبّت بھی رکھتا ہے نیز وُہ اُن میں ہمیشہ سکُونت کرتا ہے: "رُوح القُدس جو باپ اور بیٹے سے صادر ہوتا ہے"۔

یہ الٰہی عمل انبیا اور پیغمبروں کے الہام اور راہنمائی سے غیر وابستہ نہیں تھا لیکن اب خُداوند مسیح کے بعد رُوح القُدس کا زمانہ آ گیا۔ اس کی نوعیّت تو تجربہ میں آئی تھی لیکن اس کا پُورا ظہُور ایک نئی چیز تھا۔ اسی وجہ سے مسیحیوں نے اس امر کو ماننا شرُوع کر دیا کہ اُنہیں خُدا سے متعلق اپنے خیالات میں، اپنے کاموں میں، اپنے دل و دماغ میں اُس کی موجُودگی کو ضرُور محسُوس کرنا چاہیئے۔ ان میں ایک ایسی طاقت پیدا ہو گئی جس کے ذمّہ دار وُہ خُود نہ تھے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ کسی حد تک قرآن بھی انسان اور خُدا کے درمیان اس قسم کے تعلّق کو تسلیم کرتا ہے جو مسیحیوں کے رُوح القُدس کے عقیدہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن کو خُدا کا کلام مانا جاتا ہے۔ وُہ پیامبر اور رُوحیں بھیجتا ہے جن کے ذریعے وُہ کلام کرتا ہے۔ یہ رُوحیں اور پیامبر خُدا کے اور وقت اور جس کی دُنیا کے مابین درمیانی ہوتے ہیں۔ خُدا کا یہ کلام کرنے والا عمل اُس کے تخلیقی امر سے مختلف ہوتا ہے۔ ہمیں خُدا کو مختلف حیثیتوں میں تصوّر کرنا پڑتا ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ مسیحیت خُدا کو اُس کے مختلف کاموں سے سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کرتی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ خُدا رُوح ہے تو حقیقت میں ہم اس وقت اُس کے عمل اور کام کی طرف اشارہ کرتے ہیں خواہ وُہ اس فعل کے لئے فرشتوں اور رُوحوں کا استعمال کرے لیکن یہ فعلِ الٰہی ہے۔ اس لحاظ سے رُوح القُدس کا مسئلہ اس سے اور کچھ زیادہ یا کم نہیں کہ یہ خُدا اور انسان کے درمیان ایک قسم کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ ایسے خُدا کے تعلّق کو جس کا ارادہ ہمیں برقرار رکھتا ہے۔ جس کی محبّت ہمیں نجات بخشتی ہے اور جس کی رُوح انسانی دُنیا کے امُور میں بستی اور اُن کو ترتیب دیتی ہے۔ اگر خُدا انسان سے بے تعلق سمجھا جائے تو یہ کوئی فاعل خُدا کا مسئلہ نہیں سمجھا جائے گا اور نہ ہی اس بے تعلّقی سے وحدت ثابت ہوتی ہے نہ ہی وُہ ایسا خُدا ہے جس سے مذہب کو کوئی واسطہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ جب ہم تثلیث کا ذِکر کرتے ہیں تو اس سے مُراد انسان اور خُدا کے درمیان ایک خاص تعلّق ہے۔ یہ تعلق اتنا عیاں اور

حقیقی ہوتا ہے کہ اس تعلق کے ذریعے سے ہی ہمیں خُدا کی ذات کی حقیقت کا سُراغ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اور اس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے۔

خُدا سے متعلق مسیحی عقیدہ کا عملی اور تجرباتی آغاز یہی ہے عقیدہ کے اس عملی اور تجرباتی پہلو پر جتنا زیادہ زور دیا جائے بہتر ہے۔ آبائے مسیحیت کوئی کاہل فلسفی نہ تھے جن کا کام مابعد الطبیعات سے متعلق مسائل کو بیان کرنا تھا۔ اُن کے عقیدے کو جب مرتب کیا گیا تو اس سے فلسفے کی بہت پرانی گتھیاں سُلجھ گئیں لیکن اس عقیدے کے قیام اور برقرار رہنے کی فقط یہی وجہ نہیں ہے۔ یہ امر بہت ضروری ہے کہ اس عقیدے کے ابتدائی بیانات میں زیادہ زور محض عمل اور تجربہ پر دیا گیا ہے۔ جہاں علم الٰہیات ختم ہوتا ہے جیسا کہ اسے برکات کے کلمات میں ہونا چاہیئے "ہمارے خُداوند یسوع مسیح کا فضل اور خُدا کی محبت اور رُوح القُدس کی شراکت تُم سب کے ساتھ ہوتی رہے"۔ (۲۔ کرنتھیوں ۱۳: ۱۴) "کیونکہ اسی کے وسیلے سے ہم دونوں کی ایک ہی رُوح میں باپ کے پاس رسائی ہوتی ہے"۔ (افسیوں ۲: ۱۸)۔ "خُدا تعالیٰ کی حمد ہو"۔

۱۶۔ اس امر سے بہت کم لوگ انکار کریں گے کہ عقیدہ کی باقاعدہ تعریف وتشریح کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف اسی طرح ہم عقیدہ کو غلط فہمی سے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور اسی طرح یہ آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ علمائے دین کا یہ اساسی نظریہ کہ خُدا کو اُس کے کاموں سے سمجھا جا سکتا ہے، ایک صحت مند نظریہ

ہے۔عقیدہ بہت سے آدمیوں کی ضرورت کو پورا کرتا ہے، گو وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔کلیسیا اس وقت عین راستی پر تھی جب اُس نے مطالبہ کیا کہ خُدا سے متعلق مسئلہ کو عالم عمل و تجربہ سے نکال کر تعریفی و تشریحی عالم میں بھی لے جایا جائے۔چنانچہ مسیحیت اپنے عمل اور تجربہ کو ایک عقیدہ کی صُورت میں لانے لگی تاکہ آنے والی نسلیں بھی مُقدسوں کی رُوحانی و ذہنی شراکت حاصل کر سکیں۔

تمام معاملہ کو تفصیلاً بیان کرنے کے لیئے ہمارے پاس وقت نہیں، ہمیں صرف ایک بُنیادی اصُول اور چند سادہ مشاہدات پر اکتفا کرنا پڑے گا۔اصُول یہ ہے کہ ایک مسلمان کے دل کو مذہب سے مُتعارف کرانے کے لیئے ہمیں وُہی راہ اختیار کرنی چاہیئے جو کہ کلیسیا نے اپنے لیئے اختیار کی تھی۔پیشتر اس کے کہ ہم لوگوں کو اپنے عقائد کی نسبت بتائیں، ہمیں اُنہیں مسیح میں ہو کر خُدا کے پاس لانا چاہیئے۔ہمارا فرض ہے کہ ہم فضل، محبّت اور رفاقت کے احساس کا بیان کریں کیونکہ یہ خُدا کے انسان سے متعلق اوصاف ہیں لیکن ہمارے عقائد سے متعلق ذہنی اور علمی نتائج اور فوائد سے اعتراض نہ کرنا چاہیئے۔یہاں چند مشاہدات کا بیان موزوں معلوم ہوتا ہے۔

مسیحی تثلیث سے مُراد خُدا باپ، خُدا بیٹا اور رُوح القُدس ہے۔اس سے ہرگز یہ مُراد نہیں جو مُسلم اکثر سمجھتے ہیں کہ تثلیث سے مُراد خُدا، مسیح اور کنواری مریم ہے۔

باپ اور بیٹا کی اصطلاحات سے کوئی جسمانی تعلّق مُراد

نہیں یہ محض تشبیہات ہیں جب انسان گناہ اور جہالت میں غرق تھا تو الٰہی فکر نے نجات بخش محبت پیدا کی جو تواریخی مسیح کی شکل میں عیاں ہے۔ حقیقت کا یہ کلاسیکی بیان ہے کہ خُدا مسیح میں تھا، نہ کہ مسیح خُدا میں۔ جیمس ڈینی نے اس فرق کی نشان دہی ذیل کے پیراگراف میں خُوبی سے کی ہے۔ وُہ بیان کرتا ہے کہ :۔

"لفظ خُدا اسم معرفہ ہے۔ لہٰذا یہ لفظ اُس ہستی کی شناخت کرتا ہے جس کے لئے یہ استعمال کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ ایک فقرہ میں بطور فاعل کے استعمال ہو سکتا ہے لیکن یہ اُس ہستی کی ذات کی نوعیت کی نسبت کوئی نشان دہی نہیں کرتا لہٰذا یہ کسی فقرہ میں بطور خبر (PREDICATE) کے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ مسیح خُدا کا بیٹا ہے تو یہاں لفظ بیٹا خُدا کی ایک صفت سے ہمیں متعارف کراتا ہے اور اس وجہ سے اس کا اطلاق مسیح پر ہو سکتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ "مسیح خُدا ہے جو جسم کی صُورت میں ہم پر ظاہر ہُوا" تو یہ اصطلاح "جسم کی صُورت میں ظاہر" بھی ایک خبر ہے۔ یہی مُصنّف بیان کرتا ہے کہ آبائے کلیسیا اور کلیسیدون اس بیان کو نہایت ناکافی سمجھتے ہیں کہ مسیح خُدا ہے جیسا کہ وُہ اس بیان کو کہ مسیح انسان ہے بھی حقیقت سے دُور اور ناکافی سمجھتے تھے۔ جب ہم "خُدا کا بیٹا" کی اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں تو اس سے مُراد یہ ہے کہ خُدا مسیح کی ذات میں اپنے آپ کو ہم پر ظاہر کرتا ہے اور اس طرح وُہ مکمّل انسانیت کو اپنے مکاشفائی مقصد میں لئے ہُوئے ہے اور انسان کو وُہ وُہ چیز دیتا ہے جس کی وجہ سے

وُہ یہ کہنے پہ مجبوُر ہوتا ہے "یہ خُداوند ہے ہم اُس کے انتظار میں تھے۔ ہم اُس کی نجات سے خُوش وخُرّم ہوں گے"۔ (یسعیاہ ۲۵: ۹)

یہاں کوئی معقوُل وجہ نظر نہیں آتی کہ جب ہم "باپ" کی اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں تو اس کا مفہوُم جیسا کہ اکثر مسُلمان اصرار کرتے ہیں ضرُور جسمانی تعلق ظاہر کرتا ہو۔ جب ہم ALMA MATER کا محاورہ استعمال کرتے ہیں تو اس محاورے کے استعمال سے کوئی یہ مفہوُم نہیں لیتا کہ یُونیورسٹی یا کالج یا سکوُل کی کوکھ (رحم) ہے۔ محاورات کا استعمال اس لئے کیا جاتا ہے کیونکہ یہ پُرمعنی ہوتے ہیں اور یہ خبر کی نشان دہی بخُوبی کرتے ہیں۔ یہ صاف عیاں ہے کہ خُدا کے اس طرح بچے نہیں ہوتے جس طرح انسان کے بچّے ہوتے ہیں تاہم اس سے یہ مُراد نہیں کہ ہم اس پُرمعنی اور عمیق تشبیہ جس سے انسان واقف ہے کو استعمال نہیں کر سکتے یا اس کا استعمال غیر موزوں سمجھتے ہیں۔ اس کا استعمال اس لئے بھی موزوُں اور مناسب ہے کہ تمام ولدیّت اور خاندان خُود خُدا کا خیال ہے اور بقول پولُوس رسُول یہ تمام نام بھی ہمیں خدا ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔

کیا مسئلہ تثلیث خلافِ عقل ہے؟ ہو سکتا ہے کہ یہ مسئلہ ہماری انسانی عقل سے بالکل باہر ہو اور یہ کسی فلسفیانہ تحقیق سے بھی باہر ہو۔ بہرحال یہ انسانی ذہن کی مکمّل تحقیق اور پڑتال کے لئے قابلِ غور مسئلہ ہے۔ اگر انسان کا دماغ راز کی گُتھی سُلجھا نہیں سکتا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی خواہشِ تحقیق محدُود ہو کر رہ گئی ہے۔ جو شخص خُدا کو ماننے والا ہے اپنے عقیدہ کی علمی اور ذہنی عواقب

سے ہرگز گھبرانا نہیں چاہیئے ، اس کے ذریعے سے فلسفہ کے بہُت سے پُرانے سوالوں کا جواب مل سکتا ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ہم اس مسئلہ کو اس لئے ردّ کر دیتے ہیں کہ یہ ایک معمہ سا ہے تو ایسا کہنے یا کرنے سے ہمیں اس معمّہ سے خلاصی نہیں ملتی۔ مسیحی عقیدہ عین اس نکتہ سے شروع ہوتا ہے جہاں سے سب سے بڑا معمّہ شروع ہوتا ہے۔ اگر ان معمّوں کی اُس تشریح سے انکار کرتے ہیں جو کہ مسیحی عقیدہ پیش کرتا ہے تو بھی معمّہ تو موجُود ہی رہتا ہے۔ ہم اکثر اس بات کو بھُول جاتے ہیں کہ ہمیں ایک خُدا کے ماننے والے کو اپنے ایمان کا ثبوت بہم پہنچانا چاہیئے اور اس طرح مُنکرِ خُدا کو بھی اپنے انکار کا ثبُوت دینا چاہیئے۔ یہ فرض کرنا کہ اس کا کام آسان ہے ایک بودا سا مفروضہ ہے اور اگر ہم یہ فرض کریں کہ اس کو اپنے انکار کا ثبوت مہیّا کرنے کی چنداں ضرورت ہی نہیں تو یہ ہٹ دھرمی ہے۔ کسی عقیدہ کی صحت میں ہم یہ دلیل پیش نہیں کر سکتے کہ یہ ایک معمّہ اور سربستہ راز ہے۔ اگر رازِ کامل نکل آئے تاکہ افشائے راز ہو تو پھر جو عقیدہ اس کے حل سے متعلق ہے وُہ یقیناً حقیقت سے ہم آغوش ہوگا۔

غور و خوض کے بعد یہ بات صاف ظاہر ہے کہ:۔

خُدا کی وحدانیّت کا تصوّر ریاضی کے مسئلہ کے طور پر غلط نہیں کہا جا سکتا اور ایسا تصوّر مسلمانوں کے مسیحی مذہب سے متعلّق مخالف رویّہ کی وجہ ہے۔ ہستی کے زینہ پر ہم جتنا ہی اُوپر چڑھتے چلے جائیں گے اُتنا ہی ہمیں زیادہ پُر معنی اور مختلف

انواع و اقسام کی وحدتیں نظر آئیں گی ۔ اقدار کے ترازو میں ریاضی وحدتوں کو کوئی خاص اُونچا مقام حاصل نہیں ۔ مثلاً پتھروں یا ایک خلیہ والے جانداروں (UNICELLVLAR ORGANISM) کو حاصل ہیں ۔ ایک اینٹ لگانے والا دیوار پر اینٹ لگاتے وقت جو بھی اینٹ اُس کے ہاتھ میں آئے، لگا دیتا ہے کیونکہ وُہ تمام ایک جیسی ہیں اَور ایک اینٹ دُوسری کی جگہ استعمال کی جا سکتی ہے ۔ اینٹیں محض وحدتیں ہیں لیکن یہ حال ایک انسانی جسم یا ایک پھُول کے حصّوں کا نہیں ہے ۔ اِن حالتوں میں ہمارا تعلّق بڑی قسم کی وحدتوں سے ہے جن کے مختلف حصّے ہیں ۔ انسانی شخصیّتیں یا ہستیاں ہمارے تجربے کے مطابق سب سے زیادہ تنوع پسند اَور پُرمعنی وحدتیں ہیں ۔ ولیم شکسپیئر یا ابراہیم لنکن واحد اشخاص تھے لیکن وُہ اپنے اندر انواع و اقسام کے اوصاف رکھتے تھے ۔ لہٰذا اگر ارتقائی لحاظ سے وحدت کی ترتیب زیادہ سے زیادہ متنوّع اَور پُرمعنی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ خُدا کی وحدت سب سے زیادہ متنوّع اَور پُرمعنی نہیں ؟ یقیناً خُدا، باپ اَور رُوح القُدس کے عقیدے سے ہم ریاضی کا مسئلہ سمجھ کر انکار نہیں کر سکتے ۔ کیا حضرت محمدؐ صاحب ایک ہی وقت میں نبی، خاوند، بشیر اَور نمونہ نہ تھے ؟ تو کیا ایسی حالت میں وُہ ایک واحد محمدؐ نہ تھے ۔ مسلمان خُدا سے متعلق مسیحی عقیدہ کو کسی اَور بنا پر ردّ کریں تو کریں لیکن اس بنا پر ردّ نہیں کر سکتے کہ یہ عقیدہ ایک خُدا کی وحدت کے منافی ہے کیونکہ اس

کی وحدت کا انکار صرف اسی صُورت میں کیا جائے گا جب ہم مسیحی مذہب کے اس عقیدے کو ریاضی کے مسئلہ کی طرح سمجھنے یا پرکھنے کی کوشش کریں۔ ایسی کوشش بالکل بے جا ہے۔

اگر وحدت محض فلسفیانہ مسئلہ ہے تو بے جان چیز ہے۔ ہم اس کا ذکر اُس وقت بھی کر چُکے ہیں جب ہم نے قرآن اور خُدا کے تعلّق کا ذکر کیا تھا اور مخلُوق اور غیر مخلُوق کا ذکر کیا تھا۔ اگر خلقت کوئی پُرمعنی حقیقت ہے اور اگر یہ ایک پُرمحبّت عمل ہے تو اس کا آغاز ایک ایسے مقصد میں ہونا چاہیئے جو اپنی ذات میں ایک محبّت ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ خُدا محبّت ہے تو ہم ساتھ ہی یہ نہیں کہہ سکتے کہ خُدا ایک الگ تھلگ حقیقت بھی ہے اور اس طرح خُدا واحد ہے۔ بُعدِ محض بالآخر ایک طرح کا ناستک پن اور کُفر کے مُترادف ہو جاتا ہے۔ مسیحی عقیدۂ تثلیث مُسلمانوں کے اس عقیدہ کی تصدیق کرتا اور اس کو ذرا آگے لے جاتا ہے جس کی بنا پر وُہ مکاشفہ، الہام اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ایسے خُدا سے متعلّق ہے جو لوگوں اور دُنیا سے ایک حقیقی اور پُرمعنی تعلّق رکھتا ہے۔ یہ بات اس باہمی ایمان کا مسیحی پہلُو ہے۔

خُدا سے متعلّق مسیحی عقیدہ فلسفیوں یا سائنس دانوں کا بیان نہیں ہے۔ یہ بیان اور تشریح لوگوں نے نجات یافتہ اشخاص کی حیثیت سے پیش کی ہے۔ عقیدے کے اس پہلو کو جس کا تعلّق خُدا کے نجات بخش عمل سے ہے ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔ مسیحی نعرۂ تکبیر یہ ہے کہ خُدا سب سے افضل اور

بڑا ہے کیونکہ اُس نے ہم پر اپنے آپ کو بطور نجات دہندہ کے ظاہر کیا۔ وُہ حاکمیت اور خُداوندی سے متصف ہے اور اُمید بھی ہے۔ "حمد اور تمجید اور حکمت اور شکر اور عزت اور قُدرت اور طاقت ابدالآباد ہمارے خُدا کی ہو"(مکاشفہ ۷: ۱۲)

۱۷۔ ایک آخری سوال شاید ابھی باقی ہے۔ مضمون کی تفسیر و تشریح میں ہماری کوشش ناکام رہی ہے۔ تفسیر کا کام اتنی حوصلہ شکن کمزوریوں اور مشکلوں میں گھرا پڑا ہے کہ اس سے باز رہنے کی آزمائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ کیا ہم کسی آسان طریقے سے مسلمانوں کے ساتھ تعلق پیدا کر سکتے ہیں؟ بہت سے ایسے دائرے ہیں جو علم الٰہیات سے باہر ہیں اور اُن کی بنا پر ہم مُفید اور باہمی ارتباط اور تعلق پیدا کر سکتے ہیں لہٰذا جن مسائل پر اتفاق مشکل ہے اُن کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔

لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ اگرچہ ہم کم دقیق اور کم مشکل مضامین کی بنا پر اعتماد اور بیان کی عمارت چُن سکتے ہیں لیکن حقیقی معنوں میں مسیحی تفسیر کوئی بھی ایسی نہیں کہ خُدا سے متعلق علم کا بیان صحیح میں نہ دیا جائے۔ نوعِ انسان کی تاریخ اور آج کی دُنیا میں مسیحی مذہب سے باہر ایک خُدا کی سب سے زیادہ اور زیادہ پابندی سے عبادت کرنے والوں کو یقیناً خُدا باپ اور ہمارے خداوند یسوع مسیح سے متعلق علم کا پورا دعویٰ ہو سکتا ہے۔

صرف بُت پرستی ہی اسلام کے خیال کے مطابق خُدا کی وحدت کے خلاف بہت بڑی توہین نہیں ہے۔ غیر قوم بُت پرست لوگ،

آسمانی باہمی معاشرت کے جاہلانہ خیالات کی وجہ سے بہت سے خداؤں کی پرستش کرتے تھے لیکن گنہگار لوگ جو خود بُت پرستی کرتے ہیں یا خواہش پرستی کرتے ہیں وہ بھی خدا کی وحدت کی توہین کرتے ہیں۔ خدا کی وحدت کے خلاف یہ چیلنج بہت سخت اور بہت ہی گھناؤنے قسم کا ہے۔ بُت پرستی کی تردید ایک الگ بات ہے لیکن ہمیں یہ دلیل پورے جذبہ کے ساتھ پیش کرنی چاہیئے کہ خداوند کو نفرت اور گناہ کے ہر چیلنج سے اوپر رکھنا چاہیئے مسیحی روایات کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا سے متعلق ایسے علم کے محافظ اور ضامن ہیں کہ خدا اپنے پورے جلال اور نجات بخش محبت کے ساتھ حکمرانی کرتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ اسلام نے اس تواریخی عقیدے کو بھی جو حقیقت میں بُت پرستی کی مذمت کے لئے پیدا کیا گیا تھا، بُت پرستی اور شرک کا عقیدہ سمجھ لیا ہے۔ جب ایک ایسا عقیدہ ایسی حالت میں ہو تو لازم ہے کہ اس کی تفسیر و تشریح مکمل طور سے کی جائے۔

---

(۴)۔ مسیحی کلیسیا اور مسیحی معاشرہ کی تفسیر

۱۸۔ اب تک ہم اہل اسلام کے لئے اپنے فرض یعنی صلیب، انجیل، مسیح اور خُدا کے بارے میں مسیحی عقیدے کی نسبت غور کر چکے ہیں۔ اب ہم دُوسرے عالم یعنی مسیحی کلیسیا اور مسیحی معاشرہ کی جانب رجُوع کریں گے۔ اس میدان میں بھی ہمیں بہت سی غلط فہمیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بہت سی غلط فہمیاں پہلے زیر بحث آئی ہُوئی غلط فہمیوں سے ماخوذ ہوتی ہیں اور دیگر غلط فہمیوں کی وجہ تواریخی الہام ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہر غلط فہمی ہمارے لئے تفسیر کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ہم یہاں صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسیحی کلیسیا کے چند ایک ان پہلوؤں پر بحث کی جائے جو بلحاظ مسیحی تعریف اور اسلامی تفسیر کے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

کلیسیا کی ماہیت کو خوشخبری کی نوعیت کی روشنی میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ مسیح میں خُدا کے فضل کا نتیجہ ہے۔ خُداوند مسیح نے اپنے شاگردوں کا ایک گروہ جمع کیا تھا جو اُس کی تعلیم سے سیکھتے بھی تھے اور اُس کے زیر سایہ خدمت بھی کرتے تھے۔ اس نے اُن کو اپنی شخصیت کے گرد باندھ رکھا تھا اور

اِن کو یہ سکھایا تھا کہ اُن کے ایمان اور عقیدے کا مرکز یہی ہونا چاہیئے کہ مسیح میں ہی ہوں۔ اُن کے اس ایمان کو صلیب کے سخت امتحان میں سے گزرنا پڑا اور اس واقعہ سے اُن کی تمام اُمیدیں باطل ہوتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ لیکن حقیقت میں اس واقع سے ہی ان کی عام اُمیدیں تبدیل ہو کر پوری ہوئیں کیونکہ شاگرد مسیح کے تصور کو بتدریج جرأت کے ساتھ قبول کرتے چلے گئے تھے جس کا اُنہوں نے فاتحانہ اظہار کیا کیونکہ اُنہیں اِس اقرار میں اپنے آبا و اجداد کی اس خواہش سے تعلق نظر آرہا تھا کہ وہ آزادی اور نجات حاصل کریں گے۔

اسی طرح مسیح کے شاگرد اور یہودی قوم کے آبا و اجداد اس ایمان والے گروہ کے ساتھ منسلک ہو گئے جن کا یہ ایمان تھا کہ خدا مسیح میں ہو کر بنی نوع انسان کی نجات کا انتظام کر رہا ہے۔ شاگردوں کا گروہ ایک رسولی جماعت بن گئی جس میں مسیح کی قیامت کی بدولت، رفاقت اور اعتماد کی نئی پختگی پیدا ہوئی۔ یسُوع اُستاد ابھی تک اُن کی شخصیتوں کا مرکز اور اُن کی عقیدت کا مرجع تھا لیکن اب وہ مسیح خداوند تھا اور اس نام سے موسُوم ہونے لگا اور یہی سمجھا جانے لگا اور یہ سب شاگردوں کی بلاہٹ اور خداوند مسیح کی موت کے درمیانی عرصے میں اُنہیں حاصل نہیں ہُوا تھا بلکہ اس کا حصُول اُس مکمل یقین اور اعتماد سے تھا جو اُنہیں مسیح کے دُکھ اُٹھانے کے ذریعے سے حاصل ہُوا۔

اس نظریہ کے لحاظ سے مسیح کی قیامت ایک تاریخی کلیسیا

کا ذریعہ بن گئی۔ کلیسیا پہلے ہی ایک خاص اُمید اور یہودیوں کے بہت سے پُرانے نمونے اور مسیح کے قانون اور مثال کی وارث تھی لیکن اب یہ ایک نجات یافتہ اشخاص کی نئی جماعت بن گئی جو خُداوند مسیح کو اپنا منجی اور خُداوند ماننے سے معرضِ وجُود میں آئی۔ چونکہ اِس جماعت کو رُوح القُدس کی معرفت ہدایت اور قوّت ملتی تھی، اس لئے یہ تمام دُنیا میں خُدا کی اس انجیل کی خوشخبری پھیلانے کا زبردست ذریعہ بن گئی۔ صرف تین صدیاں گُذر جانے کے بعد حکومتِ وقت نے بھی اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس وقت تک اس جماعت کی یہ مخصُوص نوعیت تمام دُنیا پر روشن ہو گئی تھی کہ یہ ایک دُنیا سے الگ تھلگ جماعت، معاشرہ در معاشرہ اور خُدا کے فضل پر مبنی ایک رفاقت ہے۔

ایمان اور رفاقت کی یہ جماعت ہمیشہ اپنے وجُود پر سوچ بچار کرتی رہتی تھی اور باہمی خطُوط میں اپنے آغاز اور استحکام کے راز پر ہمیشہ غور و خوض کرتی رہتی تھی۔ چونکہ اس کے پاس پُرانی الہامی کتابیں موجُود تھیں، اس لئے یہ جماعت ایک ایسا سانچہ بن گئی جس میں انجیلی روایات، آنے والی نسلوں، زمانوں اور مُلکوں کے لوگوں کی ہدایت کے لئے ڈھلنے لگیں۔ رسُولوں کی خط و کتابت کے ذریعے سے یہ جماعت اپنے لئے نئی زندگی کے معنی، اپنی بلاہٹ اور اپنی قسمت کے راز بیان کرنے لگی۔ اسے معلُوم تھا کہ یہ وعدوں کی وارث ہے۔ خُداوند مسیح کا بدن ہے اور ایک عہد والا معاشرہ جس کی بُنیاد الہٰی رحم پر

رکھی گئی تھی اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ یہ صرف خُداوند کی حمد و ثنا کرتی رہے گی - رُوح القُدس کے ذریعے یہ خُدا کا مسکن بھی تھا اور یہ ایسا بدن بھی تھی جس میں خُداوند مسیح، اس کی سچائی، اس کا رحم برابر دُنیا میں خدمت اور تعلیم کے ذریعے کارفرما رہے گا - یہ جماعت خُداوند کی بادشاہت کے معنی کے آثار، اور مسیح میں خُدا کی دانائی اور قُدرت کی رفاقت کا نشان تھی - زمانہ ماضی اس جماعت کی تیاری کا تھا جس کی حقیقت زمانۂ حال میں ظاہر ہُوئی اور اس کا وجُود اس واسطے قائم رہا کہ اس کے ذریعے حال اور ماضی دونوں زمانے انسانی مستقبل تک پہنچیں -

یہ جماعت اپنے اندر کئی عہدوں کی حقیقت لئے ہُوئے قوموں کو شفا بخشنے کا کام انجام دینے لگی - اس رفاقت نے پُرانی دُنیا کی بہُت پُرانی تقسیموں کی حدوں کو عبُور کرنا شرُوع کر دیا - بڑے بڑے تاریخی فیصلوں میں کلیسیا عبرانی ہیکل کی حدُود سے بہُت دُور نکل گئی لیکن ایسا کرنے میں اس نے عبرانی نشو ونما کے احسان کو فراموش نہ کیا - اس نے اپنی زندگی میں یُونانی اور وحشی دونوں کا خیر مقدم کیا اور یہ اپنے عقائد کے بیان اور تشریح کے لئے بہُت سے یُونانی ذہن کے تصوّرات استعمال کرنے لگی - اس طرح یہ جماعت کھُلے دِل سے مشرق قریب، ایشیا، افریقہ اور یورپ میں اپنی تبلیغ کی توسیع کرنے لگی اور جس قدر یہ مسیح میں خُدا کی محبّت کی وُسعت کو جاننے لگی اُسی قدر اسے اپنی حقیقت کا بھی پتہ لگنے لگا -

رسُولوں کے خطوط اور مسیح کی انجیل کی انجیلی تاریخ، جن کے مصنّف اور قارئین شخص خداوند مسیح کی وجہ اور فضل سے ہی مصنّف اور قارئین ہُوئے تھے، بعدازاں کلیسیا کے لئے مستند الہامی کتاب سمجھی جانے لگی۔ ان کتابوں کو مستند درجہ دینے کے عمل سے جس کی تکمیل بعدازاں ہوئی، اِن تصانیف کو نہ کوئی مستند درجہ ملتا ہے اور نہ ہی اس طرح کلیسیا کو ان پر کوئی فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اِن کی اپنی ذات میں مستند ہونا رفتہ رفتہ، جماعت بہ جماعت واقع ہُوا۔ کلیسیا اور الہامی کتابیں دونوں مسیح، خداوند، آقا اور منجی کی حقیقت کے ماتحت تھیں اور اُس ہی کے طفیل اِن کا وجود بطور ادارہ اور تصانیف کے قائم تھا۔ اِن تصانیف کا تقاضا قارئین تھے اور ان قارئین کی ایک جماعت اِن تصانیف کی مالک تھی۔ چونکہ اس جماعت کے بُنیادی امور اور اس کی تواریخ قلمبند کئے جانے کے مقتضی تھے، سو اس طرح یہ الہامی کتابیں تصنیف ہُوئیں۔ الہٰی کُتب کلیسیا کا اثاثہ تھیں اور کلیسیا کے قبضے میں اس لئے تھیں کہ کلیسیا دراصل الہامی کُتب کے حقائق کے قبضے میں تھی۔ کلیسیا کی وجہ سے یہ کتابیں گردش میں تھیں اور اس حقیقت کی وجہ سے جس کا بیان اِن کتابوں میں تھا، کلیسیا معرض وجود میں آئی۔

جس مکاشفہ کے فہم پر جماعتی رفاقت اور الہامی کُتب کا انحصار ہے، وُہ پہلے بھی زیر بحث آچکا ہے۔ اس سوال کا جواب (جو بعض مسلمانوں کی دلچسپی کا باعث بھی ہے) کہ کیا خداوند مسیح ایک کلیسیا قائم کرنا چاہتے تھے، اب بالکل عیاں ہے۔

اگر خداوند مسیح کا مقصد سکھانا اور لوگوں کو نجات دینا تھا تو کیا سامعین اور نجات یافتہ لوگوں کی تنظیم کا تسلسل ایک ناگزیر امر تھا؟ اس سے مُراد یہ نہیں کہ مسیح خداوند کا ارادہ تمام تواریخی کلیسیائیں قائم کرنا تھا لیکن اس کا مطلب یہ ضرور ہے کہ جو تعلق عقیدتمندوں اور شاگردوں کو مسیح سے ہے وہی تعلق وہ اُن میں باہمی طور پر بھی دیکھنا چاہتا تھا اور یہ تعلق محض اشتراکِ عمل کی صورت میں نہیں، بلکہ ایک جماعتی رفاقت کی صورت میں ہے جس کی بُنیاد ایک مُشترکہ ایمان اور عقیدت پر تھی۔ ایمان درا‌صل ایک رفاقت ہے۔ مسیحی بن کر ہم اکیلے نہیں رہ سکتے۔ خداوند مسیح نے بھی ہم کو دُعا مانگتے وقت سکھایا تھا۔ "اے ہمارے باپ"۔ جب شاگرد خداوند کے غم کی حقیقت میں شریک ہو گئے تو وہ جماعتی رفاقت کے احساس مخفی سے بھی بھرپور ہو گئے۔

اہل اسلام کلیسیائی قیام کے جواز سے انکار اس لئے کرتے ہیں کہ مسیح خداوند سے کچھ زیادہ واقف نہیں۔ جب مسیح کے بارے میں اِن کی واقفیت وسیع ہو جائے گی تب اُنہیں اُن کے انکار کا جواب مِل جائے گا لیکن تمام انکار نہیں کرتے، بہُت سے مُسلمان مُصنّف ایسے ہیں جو قرآن کے چند حوالوں کے مطابق مسیح کے شاگردوں کا شدّت سے ذِکر کرتے ہیں اور اُنہیں خداوند مسیح کے صعُود کے بعد جوشیلے مبلّغ قرار دیتے ہیں۔ اُن کا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ صلیب کے بیان کو نظرانداز کر کے براہِ راست یسُوع ناصری اور رسُولوں کا تعلق بیان کرتے ہیں۔ یہاں

یہ سوال کس قدر مناسب ہے کہ جب مُبارک جمعہ کے بعد مُنتشر شاگردوں کے حواس بجا ہُوئے تو کیا وُہ صرف ایسے مسیح کے مبلغ ہو گئے جو کسی بہانے موت سے بچ نکلا اور اب اِن کے درمیان موجُود نہ تھا؟ ہم صلیب کے بیان میں یہ ذِکر کر چُکے ہیں کہ یہ مفروضہ ناقابلِ یقین ہے۔

۱۹۔ کلیسیا کے تاریخی ماخذ سے متعلق مُسلمانوں کا جو رویّہ ہے اس کے علاوہ اور بہُت سے اہم مسائل ہیں جو اکثر سامنے آتے ہیں اور جن کا تعلق زیادہ تر انسانی معاشرہ سے ہے۔ اس میدان سے متعلق ایسے مسائل ہیں جو بہُت گہرے اور اہم ہیں۔ ایک مُفسّر کو وُہ تمام مُتضاد باتیں ترک کر دینی چاہئیں جو مسخ شدہ ہیں۔ ایک مُسلم اپنے اس عقیدہ پر خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ اسلام میں نظریۃً کسی قسم کی تمیز جائز نہیں۔ اسلام، معاشرہ اور مذہب، ایک مومن اور شہری، عقیدہ اور تہذیب میں بھی تمیز نہیں کرتا۔ اسلام ایک عملی اور قابلِ عمل مذہب ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ ہم یہ دیکھ چُکے ہیں کہ عام طور پر ایک مُسلم مذہب کے اس نظریہ کی قطعاً تردید کرتا ہے جس کی رُو سے مذہب اور دُنیا یا مذہب اور حکُومت دو الگ الگ شعبے سمجھے جاتے ہیں اور جس کی رُو سے مذہب کو محض خُدا اور رُوح سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔

مُسلمانوں کے اسلام سے متعلق اس نظریہ کے ایسے پہلو بھی ہیں جو اگر اچھی طرح سمجھا جائے تو مسیحیّت میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن ایسے پہلو بھی موجُود ہیں جو تنقید اور چھان بین پر انسانی معاشرہ

اور طبیعت سے متعلق ناقص علم پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی اچھی اور باصبر تنقید صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم مسیحیت کو نہایت سادہ طریقہ سے پیش کریں اور اس مقام پر ہم مسیحیت سے متعلق تمام غلط فہمیوں کو کماحقہٗ رفع کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی بحث میں حقیقت کی سطح کو بلند کر سکتے ہیں۔

زمانہ ماضی اور حال کے بہت سے مسلم مصنفین مسیحیت پر اس بنا پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں کہ یہ مغربی تہذیب کو ضبط اور قابو میں رکھنے سے قاصر رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسیحیت قومی مفاد پرستی اور شہنشاہیت کی روک تھام نہیں کر سکی بلکہ برعکس اس کے اس نے مغربی اقوام کے غلبہ میں ان کی مدد کی ہے اور ان کے ساتھ تعاون کیا ہے۔ وہ مشن اور تبلیغی تحریکوں کو بھی ایک قسم کی مغربی شہنشاہیت سمجھتے ہیں اور ایسے ناقد بھی ہیں جو مختلف اور برعکس مفروضات پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ مسیحیت پر یہ اعتراض نہیں کرتے کہ یہ مغربی اقوام اور تہذیب کی شرارتوں اور خود غرضیوں میں ان کا ہاتھ بٹاتی رہی ہے بلکہ ان کا اعتراض یہ ہے کہ مسیحیت ایسے حالات میں بالکل الگ تھلگ رہی لہٰذا مسیحیت دونوں الزامات سے بری الذمہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بلند بانگ نظریات اور ایک قطعی قسم کے اخلاق کا مذہب ہے اور اس دنیا میں اس کے نظریات پر عمل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ ایسے مذہب کی صورت میں معاشرہ صرف زبانی جمع خرچ کرتا ہے لیکن عملی طور پر اس مذہب کے احکام پر عمل نہیں کرتا۔ اس طرح مذہب بھی ماننے والوں کو

ایک راہبانہ اور منفرد قسم کی گوشہ نشینی پر مجبور کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا واجب نہیں کہ مسیحیت نے تہذیب کے سنوارنے میں کوئی مدد نہیں کی بلکہ معاملہ یوں ہے کہ مسیحی کلیسیا کا عقیدہ ناقابلِ عمل ہے بہرحال دونوں قسم کی نکتہ چینیوں سے یہ بات ماخوذ ہوتی ہے کہ مسیحیت دُنیا کو راہِ راست پر لانے میں بُری طرح ناکام رہی ہے۔

اگر ہم ان متعلقہ مسائل کا صبر اور حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم مسیحیت کے ان احسانات کی تاریخی لحاظ سے جانچ پڑتال کریں جو اس نے مسیحی محبت، اخلاق اور قربانی کی وجہ سے مشرق و مغرب کی دُنیا پر کئے ہیں لیکن ایسا کرنے سے بھی ہمیں مکمل جواب دستیاب نہیں ہوگا اور نہ ہی ان مسائل کا تسلی بخش جواب یہ کہنے سے ملے گا کہ مسیحی کلیسیائی تنظیم اس وجہ سے ناکام رہی ہے کیونکہ اس کے اندر کمتر اور ادنیٰ قسم کے مسیحی ہیں جو مسیحیت کے پوری طرح تابع اور وفادار نہیں۔ ہمیں انقلابی اور حقیقت پسند دونوں ہونا چاہیئے مسیحیت کو سُرخرو کرنے کے لئے ہم یہ نہیں کر سکتے کہ صرف مغربی تہذیب کی تمام اچھائیوں اور قابلِ تحسین چیزوں کا ذکر ہی کیا جائے اور بُری چیزوں کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا جائے کہ یہ مسیحیت سے بے اعتنائی برتنے کا نتیجہ ہیں۔ یہ ایک مسیحی اصُول ہے کہ ہم پہلے اپنے واسطے انقلابی رویہ اختیار کریں اور گناہ کی تشخیص کا اطلاق مذہب پر کریں اور کسی صُورت میں بھی رُوح اور دماغ کے اِن پہلوؤں کو ملامت کرنے سے باز نہ رہیں جن سے ہمیں توبہ کرنے کی ضرُورت ہے۔ جب ایک مذہب ناکام ہو جاتا ہے تو ہمیں اُس کی ناکامی کا اعتراف کر لینا چاہیئے اور مذہب کے پیرو

کو مُجرم قرار دینے سے اس کو بری الذمّہ قرار دینے کی کوشش کرنا چاہیئے۔کیونکہ مذہب کے پیرو اس مذہب کی کسی حد تک ایک اہم یادداشت ہیں اور اس کی حقیقت کی کسی حد تک نشان دہی کرتے ہیں۔ ان وجوہات کی تہ میں تمام مسئلے کا نچوڑ ہے۔ نئے عہدنامہ میں جو کلیسیا کا تصوّر ہے وُہ ایک معاشرہ در معاشرہ کا تصوّر ہے۔کلیسیا سے تمام انسانی معاشرہ کبھی مُراد نہیں لیا گیا۔ عالمِ مسیحیت اگرچہ کسی حد تک صحیح اصطلاح ہے لیکن یہ کوئی مسیحی مذہب سے متعلق نظریات میں شامل نہیں۔کلیسیا سے مُراد ہے "بُلائے ہُوئے لوگ"۔ اس کی بُنیاد نجات کے تصوّر اور حقیقت پر رکھی گئی ہے لہٰذا اس کے جائزہ کے مطابق انسانی طبیعت گُناہ آلُود اور بگڑی ہُوئی ہے۔ اس بگاڑ کا علاج مسیح میں نئی زندگی کی صُورت میں ہوتا ہے لیکن اس کے لئے وفاداری کے وعدہ اور ایمان کی شرط ہے (یوحنا ۱: ۱۲) "لیکن جتنوں نے اُسے قبُول کیا اُس نے اُنہیں خُدا کے فرزند بننے کا حق بخشا یعنی اُنہیں جو اُس کے نام پر ایمان لاتے ہیں"۔ یہاں دو قِسم کے انسان ہیں، ایک طبعی جو سرکش ہے اور دُوسرا رُوحانی مخلُوق جو نجات یافتہ اور نئے سرے سے پیدا شدہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیسیا میں پہلی قِسم کے لوگ بھی داخل ہیں۔ مسیحیوں کے خیال کے مطابق انسان دُنیا کو صرف خُود راست باز ہونے سے اور اپنے ایمان کے وسیلے ہی سے راہِ راست پر لا سکتا ہے۔

لہٰذا نیکی، صداقت اور محبّت کا ظہُور طبعی انسان کی صُورت

میں نہیں بلکہ نئے سرے سے پیدا شدہ انسان کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ بخشش صرف توبہ اور ایمان کی صورت میں ہی مل سکتی ہے اور مسیح کی شاگردی میں اس کو ثبات ملتا ہے۔ مسیحیت اِن لوگوں کا مذہب ہے اور انہی میں سے ماخوذ ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ کسی معاشرے کا مذہب نہیں۔ بہت سے معاشرتی ادارے، بہت سے قوانین، رواج، دستور، عادات اور تصورات مسیحی بن سکتے ہیں لیکن مسیحی حقیقت کا اس سے تعلق ایک حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِن کی حیثیت اور ماہیئت اِن لوگوں سے ماخوذ ہے جو مسیحی عقیدہ رکھتے ہیں اور جو نئے سرے سے پیدا شدہ ہیں۔ لہٰذا مسیحیت کا وجود جس چیز میں رہتا ہے وہ معاشرہ نہیں بلکہ معاشرہ کے لوگ ہیں۔ جس طرح آگ کا وجود کوئلے کی وجہ سے ہے لہٰذا مسیحیت کا مرجع اشیا نہیں بلکہ معاشرہ کے لوگ ہیں۔

لہٰذا اِن لوگوں کی مسیحی رفاقت جو خداوند مسیح کے شاگرد ہیں اور اُسے اپنا خداوند اور منجی سمجھتے ہیں تمام آبادی کے اندر ہوتی ہے لیکن یہ رفاقت کسی طرح بھی تمام آبادی سے منطبق نہیں ہوتی۔ اس کی خاصیت ایسی ہوتی ہے جیسی کہ کسی جراثیم کش دوا کی۔ جہاں تک ہو سکے یہ لوگوں کو نیا مخلوق بناتی چلی جاتی ہے اور اپنے ماحول میں غیر مسیحی حالتوں کا مقابلہ کرتی جاتی ہے۔ اس سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیئے کہ یہ کل کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں کل کے ساتھ مطابقت رکھنے کی خواہش نہیں۔ اس کی کل کے ساتھ مطابقت اس لئے نہیں کیونکہ اس کل

کے کچھ حصے پُوری طرح وفادار نہیں اور یہ پُوری وفاداری ہی ایک حقیقی مسیحی کی علامت ہے۔ ایک نئی اور پُرانی مخلوق میں مسیحی نقطۂ نظر سے تمیز کی وجہ بُنیادی طور پر انسانی طبیعت کا بگاڑ اور یہ ایمان ہے کہ انسان کو نیک بننے پر مجبُور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انسان کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وُہ نیک بننا چاہتا ہے یا نہیں۔ جتنا انسان اپنی وفاداری کو پیچھے رکھیں گے اُتنا ہی وُہ خُدا کی بادشاہت سے دُور رہیں گے۔ یہ بادشاہت محبت کی وجہ سے ان کو بالکل نظرانداز نہیں کرے گی لیکن یہ ان کو مجبُور بھی نہیں کرے گی کیونکہ اس بادشاہت کی وفاداری خُوشی پر منحصر ہے نہ کہ جبر پر۔

کلیسیا کو بخوبی سمجھنے کے لئے یہ ضرُوری ہے کہ رُوحانی مخلُوق اور طبعی مخلُوق کا فرق اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ فضل کی انجیل یہ فرض نہیں کرتی کہ آدمی شریعت کے ذریعے سے کامل بن سکتے ہیں نہ ہی یہ بات فرض کر سکتی ہے کہ چُونکہ شریعت کا مکاشفہ مل چُکا ہے لہٰذا اس مکاشفہ کے وارث اس کی وجہ سے ایک کامل معاشرہ بن گئے ہیں۔ ایک جماعت جو لوگوں کو انتخاب کا اختیار دیتی ہے وُہ لوگوں کو اپنی جماعت میں دھڑا دھڑ بھرتی بھی نہیں کر سکتی، لہٰذا مسیحیت ایک سیاسی نظریہ نہیں ہے۔ حقیقت پسند مسلمان بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ اسلامی شریعت نے بھی اپنے عرصۂ مدید میں کبھی کسی جگہ بھی تاریخ میں کوئی حقیقی اسلامی معاشرہ قائم نہیں کیا۔ نظریہ اور اعمال و کردار میں ہمیشہ تفاوت رہا ہے لیکن اسلام اس بات

پر مصر ہے کہ یہ تفاوت محض حادثی حیثیت رکھتا ہے ۔ ان کے خیال کے مطابق جن لوگوں کو الٰہی ہدایت کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے کے لیئے شریعت مل چکی ہے، انھیں سیاسی طور پر منظم ہونا چاہیئے اور اس طرح انہیں ایک کامل معاشرہ بننا چاہیئے ۔

اس کے برعکس ایک مسیحی کا نظریہ یہ ہے کہ نجات یافتہ لوگوں کی جماعت ہمیشہ ایک جماعت کے اندر نبرد آزماؤں کی طرح موجود ہوگی اور یہ کبھی بھی اس کے ساتھ بالکل منطبق نہیں ہو گی ۔ کل کو یعنی دُنیاوی کل کو اجازت اور اختیار ہے کہ وہ اپنی تنظیم اپنی مرضی کے مطابق کرے ۔ اگر ہم کو قانون اور جبر سے راست بنانا چاہیں تو یہ ہماری خوش فہمی ہے ۔ ہم کبھی بھی جبر اور قانون کے ساتھ اس کو مسیحی نہیں بنا سکتے ۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس کی سرکشی اس کی آزادی کی وجہ سے ہے اور ہمیں صبر کے ساتھ اس کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ اس کا راہِ راست پر آنا چند شرائط پر مبنی ہے اور اگر ہم ان شرائط سے انکار کرتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور دُنیا کو بھی ۔

یہی ایک بُنیادی وجہ ہے جس کی بنا پر مسیحیت میں دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں سمجھی جاتی ہیں ۔ یہ فرق اس مسئلہ کا دُوسرا پہلو ہے جس کی بنا پر انسان کو ضرورت کی حالت میں اور خُدا کو فضل کی حالت میں سمجھا جاتا ہے ۔ مسیحیت کا سیاست سے علیحدگی کا یہ مطلب نہیں کہ مسیح کا اس زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی مسیحیت ایسی ذمہ داری سے سُبکدوش ہوتی ہے ۔

یہ لاتعلقی بھی ظاہر نہیں کرتی اور نہ ہی گوشہ نشینی اور راہبانیت کی حامی ہے۔ یہ اپنی سماجی ذمہ داریوں کے فرض سے عدم ادائیگی کی مرتکب نہیں۔ اگر یہ ایسا فرض کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو کسی نجات کا محتاج نہیں سمجھتی اور نہ ہی خدائی بادشاہت میں داخل ہونے کے لئے کسی شرط کی ضرورت سمجھتی ہے لہٰذا ہمیں مسیحی جماعت اور انسانی معاشرہ اور نیکی کے معیار کے تعلق کو صبر و تحمل کے ساتھ بیان اور تشریح کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۰۔ ایسی باتحمل تفسیر کے ذریعے یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ دین اور سیاست کا آمرانہ طور پر اکٹھا کر دینا کوئی حقیقت پسندی پر مبنی نہیں۔ جب مذہب کو اس دُنیا کی طاقت کے ساتھ اکٹھا کر دیا جاتا ہے تو مذہب کی اصلیت اور خاصیت میں ضرور فرق پڑ جاتا ہے۔ اس دُنیا کی حقیقتوں میں تمیز صحیح صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ لوگوں کی ان کے روزمرہ کے دُنیوی مشاغل سے بلاہٹ کی جائے نہ کہ ان کو کافی و شافی سمجھ کر ان کو برکت دی جائے۔ اسلام کے سامنے یہ ہماری گواہی کا ایک حصّہ ہے۔ نئے عہدنامہ کی رُو سے مسیحی زندگی ہماری اپنی بساط سے باہر ہے۔ یہ نجات کا پھل اور خدا کے فضل کی بخشش ہے۔

تاہم یہ بات بھی واضح کر دینا نہایت ضروری ہے کہ مسیحی کلیسیا معاشرہ سے بالکل لاتعلق نہیں اور نجات کا مسئلہ اس دُنیا کو لاعلاج اور ناقابلِ اصلاح نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس کے برعکس اس کے نجات بخش مقصد میں یقین ہمیشہ دُنیوی تاریخ میں کارفرما رہا

ہے اور ہوتا رہے گا اور اس طرح دُنیا کے مستقبل کے لئے ہمیشہ ایک بڑی اُمید کی شمع جلاتا رہا ہے۔ منجی خُداوند مسیح نے بار بار اپنی بادشاہت کا وعدہ کیا ہے جس میں تمام چیزیں اُس کے ماتحت ہو جائیں گی۔ انقلاب پسندی کی حالت میں کلیسیا بے اُمید نہیں ہوتی۔ "قنوطیت"، بمعنی "مایوسی کی کیفیت" یا "حالت یاس"۔ بہتر ہو اگر عام فہم لفظ استعمال کیا جائے یا جب یہ نئی پیدائش کا اعلان کرتی ہے تو یہ زہد پسند نہیں مسیحیت محض انسان کی ہمیشہ کی زندگی سے متعلق نہیں نہ ہی مسیحی ایمان رُوح اور خُدا کے درمیان ایک ذاتی مسئلہ ہے مسیحی ہونے سے مُراد یہ ہے کہ صلیب اُٹھائی جائے، دُنیا کے لئے ذمہ داری اُٹھائی جائے، معاشرتی بُرائیوں کے خلاف گواہی دی جائے اور تمام اطراف میں اقتصادی عدل و انصاف کے لئے کوشش کی جائے۔ جب ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ محض احوال کے بدلنے سے انسان نہیں بدلا جا سکتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم احوال کے بدلنے سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ اس بات کو سمجھنا کہ احوال اور ماحول انسانوں سے جو اس میں رہتے ہیں کسی طرح مختلف نہیں ہو سکتے تو اس سے یہ مُراد نہیں کہ ہم ماحول اور احوال سے بے پروائی کا اظہار کر رہے ہیں۔ مسیحیت کو غیر ذمہ دار زہد سمجھ کر نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ اس کے برعکس ایک مسیحی جو صلیب کو اپنا ذریعہ جانتا ہے اور اس کا اعتراف کرتا

لہ "فعال" کا لفظ اس مسودہ میں چند بار استعمال ہُوا ہے۔ اگر اس کا مفہوم "کام کرنے والا" ہے تو کیا لفظ "عملی" استعمال نہیں ہو سکتا؟ جیسے "فعال کی راستبازی" کی بجائے "عملی راستبازی" ہے۔

ہے وُہ اپنے خُداوند کے حقوق نظامِ دُنیا پر جتانے کے لئے بُلایا گیا ہے۔ جو راستبازی اس کی نجات کا باعث ہے وُہ ایک فعال راستبازی" ہے۔ ہم مسیح میں اپنے پڑوسی اور تمام دیگر احوال کے لئے خواہ سیاسی ہوں یا اقتصادی یا بین الاقوامی جو اس زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں ایک ذمّہ داری کی زندگی بسر کرنا سیکھتے ہیں۔ مسیحیوں کے لئے مسئلہ تجسّم سے مُراد یہ ہے کہ انسان کے ذریعے سے خُدا کی ذات کی عکاسی کی گئی ہے لہٰذا اس سے زیادہ لغویات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ مسیحی مذہب عمیق معاشرتی ضمیر سے الگ تھلگ ہے اور یہ کہ اس پر عملدرآمد ہونا مشکل ہے۔ ہم مغربی تہذیب کی بُرائیوں کی ذمّہ داریوں سے یہ کہہ کر چھُوٹ نہیں سکتے کہ اُن سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے برعکس اس معاملہ میں بھی ہم اپنی اخلاقی ناکامیوں کا اقرار کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے کہ کلیسیا مکمل انسانی نجات کے مسئلہ کو ایمان سے جُدا نہیں سمجھتی۔ یہ مُراد نہیں کہ سماجی جنگ کے بڑے لیکن کمتر کاموں کی ناکامی کی ذمّہ داریاں ہم دُنیا میں دُوسروں پر ڈال دیں۔ جہاں تک دُنیوی قوانین اور اداروں کو پاک اور پُر رحم بنانے کا تعلق ہے، اس میں بھی ہماری کوشش کچھ کم نہیں، کیونکہ بالآخر ہمارا مقصد انسان کی نجات ہے۔ جو کوئی مسیحیت کو اس بنا پر ردّ کرتا ہے یقیناً اُس نے ابھی اسے سمجھا ہی نہیں۔

اس وقت جبکہ اس موضوع پر بہت بڑی بحث ہو رہی ہے مسیحیت کے سماجی اور معاشرتی معاملات میں کردار کی

توضیح اسلامی مفکرین کے اندرونی مسائل کے روشن کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوگی۔ کیا ایک آمرانہ عقیدے کا مقصد معاشرہ کو جبر و تشدد سے قابو میں لانا ہے اور اس طرح اس سے اطاعت کروانا ہے؟ یا اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی رائے میں جذب ہو کر اُن کو اُسے قبول کرنے پر مجبور کر دے؟ کیا کسی طرح سے یہ ممکن ہے کہ ایک سیاسی نظام غلبۂ مذہب کو بغیر اسے زک پہنچائے آزاد ہو؟ اگر مذہب، سیاست اور معاشرہ کی خامیوں کی نشان دہی کرتا ہے تو ان خامیوں کو دُور کرنے میں اس کا اصلی عمل کیا ہے؟ بہت سے مسلمان اپنے آباؤ اجداد کی طرح آج اتنے وثوق سے نہیں کہتے کہ مذہب کے لامحدُود مطالبات پُورا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مذہبی شریعت اور احکام کو زیادہ سے زیادہ لامحدُود طور پر ٹھونسا جائے۔ مسیحیت کو بھی اس بات سے اتفاق ہے کہ الٰہی احکام قطعی اور کُلی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے دائرہ سے کوئی چیز باہر نہیں لیکن مسیحیت اس بات پر اتفاق نہیں کرتی کہ ان مطالبات کو آمرانہ طور پر باہر کے سیاسی یا مذہبی جبر و تشدد سے پُورا کیا جا سکتا ہے۔ اس مقام پر مسیحیوں کو اپنے نکتۂ نظر کی تشریح کرنے کے لئے کافی گنجائش ہے اور یہ تشریح کلیسیا کی حقیقت اور اصلیت کی بنا پر ہو سکتی ہے۔

۲۱۔ ایک اور میدان جس میں مسلمان غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتے ہیں، وہ مذہبی پیشہ وروں اور مسیحی رسومات سے متعلق ہے۔ اسلام اس بات پر نازاں ہے کہ وہ پیشہ ور مذہبی راہنماؤں سے آزاد ہے۔

یقیناً اسلام میں بھی ماہرین مذہب ہیں۔ اسلام جیسا دقیق اور نفاست پسند مذہب ماہرین کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کے سب ماننے والے یکساں ہیں تو اس سے یہ مُراد نہیں کہ زید، عمرو بکر شریعت کی تفسیر و تشریح کا دعویٰ کر سکتا ہے بعض اوقات نوابیّت (مشائخ) (SHEIKH- HOOD) نے مذہبی اور ذہنی زندگی پر ایسا غلبہ حاصل کیا ہوتا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا پیشہ ورانہ مذہبی غلبہ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، گو اس کا ماخذ ذرا مختلف ہوتا ہے لیکن اسلام میں ہر مومن خُدا کے پاس بغیر کسی انسانی وسیلہ کے پہنچ سکتا ہے۔ جب اہلِ اسلام مسیحیت کے خلاف اس لئے زبان کھولتے ہیں کہ اس میں پیشہ وروں کا تسلط ہے تو وُہ اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مسیحیت میں بھی بہت سے لوگ ہیں جو مسیحیت کے اس پہلو کو پسند نہیں کرتے ہیں اور انہوں نے بسا اوقات اس کی خود تردید کی ہے۔ نئے عہد نامہ میں کوئی ایسی رُوحانی غُلامی کی مثال موجُود نہیں جس میں خُدا کا گلہ رُوحانی اور مذہبی آقاؤں کے تسلّط میں رہا ہو۔ خُداوند مسیح کے شاگردوں نے خُود بھی اپنے رُوحانی اختیار کا ہمیشہ عاجزی اور انکساری سے جائزہ لیا، پھر اصلاحِ کلیسیا بھی اس بات کی شاہد ہے۔ ہم صرف ویسے ہی کلیسیائی نظام کے حق میں بول سکتے ہیں، جس کو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ خُداوند مسیح کی جانب سے ہے۔ اس لحاظ سے اس قسم کا نظام خُدا کا آلہ سمجھا جاتا ہے نہ کہ ایک رُوحانی غلبہ۔ دُعا اور رسُوم کی ادائیگی میں ایک مسیحی مذہب کے راہنما کا کردار ایک مسیحی کو کسی

طور پر اس کا رُوحانی طور پر دستِ نگر نہیں بنا دیتا۔ برعکس اس کے ایک پادری تمام کے لئے اور تمام کی اجازت سے کام کرتا ہے۔ اگر دُعا کبھی کبھی پیشہ ورانہ کی جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں شخصی پن اور آمد کا عنصر قائم نہیں رہتا جس طرح مُسلم شرلعیت لازماً اُن لوگوں کا حِصّہ سمجھی جاتی ہے جنہوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے اور جنہوں نے اپنے آپ کو اس کام کے لئے مخصُوص کیا ہے اِسی طرح خُدا کی نجات کی خُوشخبری کے افہام، تفہیم، روایات و رسُوم کا مسئلہ بھی اُن لوگوں کا حِصّہ ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں اس مُقدّس کام کے لئے وقف کی ہیں اور جو اس کے اہل ہیں اور جن کو اس کے اہل سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک مسیحی رسُوم کا تعلّق ہے ان کی تشریح مُسلمانوں کے لئے بہُت کم کی گئی ہے۔ اسلام میں بھی مذہبی رسُوم موجُود ہیں مثلاً وضُو، نماز کے وقت خاص طریقے سے اُٹھنا بیٹھنا، قبلہ کا مکّہ کی طرف ہونا، حج اور رمضان یہ سب مذہبی رسُوم ہیں اور یہ سب رُوحانی حقائق کے اظہار کے لئے دُنیوی طریقے ہیں۔ یہ مسیحی مذہب کے بپتسمہ اور عشاء ربانی کی رسموں کو سمجھنے میں کافی نشان دہی کرتے ہیں۔ شرلعیت اور فضل کے مختلف ماخذوں کو چھوڑ کر باقی رسُوم کا اصُول ایک ہی ہے۔ حقیقت میں ایک مسُلمان قرآن کی رُو سے کہہ سکتا ہے کہ جہاں بھی ایک مذہبی رسم ہے کیونکہ یہ خُدا کے جلال کا نشان اور مظہر ہے۔ مسئلہ تجسّم میں ہماری اس حقیقت کا نقطۂ عرُوج ہے کہ یہ مادی دُنیا زندہ خُدا کا مظہر ہے۔ چُونکہ ایک مُسلم صلیب کے بارے

ہیں پہلے ہی سے کوئی ایمان نہیں رکھتا لہٰذا روٹی اور مے کے مسیحی معانی جو حقیقت میں خُدا کے مجسّم کلام کے دُکھوں کا اظہار کرتے ہیں ایک مُسلم کے لئے کوئی وجُود نہیں رکھتے لیکن اس کے اپنے مذہب میں بھی رسُوم کی ایسی اشکال موجُود ہیں جو ہماری رسُوم کے دل کو تو نہیں بہرحال اصُول کی توضیح میں کافی معاون ہو سکتی ہیں جو مسیحیت میں رواج پذیر ہیں۔ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جب ہم روٹی توڑتے ہیں تو ایسا کرنے سے ہم مسیح کو اُن لوگوں سے متعارف کراتے ہیں جو مسیح کو اس لئے نہیں پہچانتے ، کیونکہ ابھی تک اُن کی آنکھیں بند ہیں۔ شاید ہم نے اس امر پر خاص توجہ نہیں دی کہ مُسلمانوں کو مسیحی رسُوم کے ذریعے کلیسیا کا تعلّق زندہ مسیح سے دکھائیں۔ اگرچہ ادب آمیز الفاظ عبادت کے مفعُولی معنی کی تشریح کر سکتے ہیں لیکن اس کا پُورا پُورا مفہُوم صرف رفاقت اور شراکت کی حقیقت ہی سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ کسی نہ کسی طرح یہ بھید اور شرائع اجنبی لوگوں تک بھی پہنچائیں۔

یہ غور و فکر ہمیں آخری نقاط تک پہنچاتا ہے۔ پاک عشا ایک روٹی اور ایک پیالے کی متبرک رسم ہے لہٰذا یہ یگانگت کی پاک رسم ہے۔ الفاظ اور کردار میں کلیسیا کی مسیحی تشریح کرتے وقت ہم کلیسیا میں تقسیم کے المیہ سے گریز نہیں کر سکتے۔ تھوڑی بہت حد تک اور کسی نہ کسی صُورت میں فرقہ بندی اور تقسیم ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ ایک دیانتدار مسیحی یہ سمجھ کر کہ ایک دیانتدار مُسلم بھی اسلام میں اس مسئلہ کی موجُودگی سے آگاہ ہے اس کا حل ڈھونڈنے کی

ذمہ داری سے چھوٹ نہیں سکتا۔

منقسم شدہ مسیحی وفاداری کے چند ماخذ ایسے ہیں جو کوئی زیادہ تشویش ناک نہیں۔ زبان، تہذیب، معاشرہ اور ماحول کے اختلاف کی وجہ سے جو تفرقات ہیں اُن کی وجہ سے عبادت اور طرزِ بیان کے لئے مختلف تنظیمیں قائم کرنے کے لئے جواز موجود ہیں۔ چند ایک تفرقات ترتیب اور نمونہ کے تفرقات ہیں جو اگرچہ باہمی یگانگت اور حقیقی رفاقت سے بھی دُور نہیں ہو سکتے تاہم یہ اتنے شدید نہیں۔ ہمیں غیر مسیحی دُنیا کے لئے کلیسیا کے اتحاد کی روزمرہ بڑھتی ہوئی تحریک کی اہمیت کا بیان کرتے رہنا چاہیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض تواریخی تفرقات کی تہ میں بہت عمیق، ناقابلِ تردید اور حقیقی محرکات موجود ہیں مثلاً آزادی، زندہ ضمیر، اپنے عقیدہ اور ایمان سے وفاداری اور غاصبانہ غلبہ سے آزادی کے محرکات جن کا ضیاع کلیسیائی تقسیم سے بھی بُرا ہے، کیونکہ ان محرکات میں وہ اقدار پوشیدہ ہیں جن کی قیمت یکسانیتِ محض اور باہر سے ٹھونسی ہوئی وحدت سے کہیں زیادہ ہے۔ جو سبق ہم نے ایسی بغاوتوں سے سیکھے ہیں اور جو برکتیں اُن کی وجہ سے ان کلیسیاؤں پر بھی نازل ہوئیں جن کے خلاف یہ بغاوتیں واقع ہوئیں، اب ہماری ایک وراثت بن چکی ہیں۔ کلیسیائی تقسیم ایک لحاظ سے ایک بخشش بہا چیز کی قیمت ہے۔

ان تمام باتوں اور وجوہات کے باوجود کلیسیائی تفرقات ایک مسیحی مفسر کے لئے باعثِ لجاجت اور پریشانی ہیں۔ اگرچہ کلیسیاؤں کے اتحاد کی تحریک ایک متاثر کرنے والی چیز ہے تاہم آج کل بھی بہت سے ایسے

مشنری فرقے تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں جو محض عدم تعاون کے لئے مخصوص ہیں۔ اس سے زیادہ خطرناک بات ایک ہی وراثت میں علیحدگی کی نیت ہے جس کے لئے کوئی جواز نہیں۔ ابھی تک مسیحی لوگ معمولی سی باتوں اور معمولی سی وجوہات کی بنا پر بہت زیادہ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک مُفسّر کا فرض یہ ہے کہ وُہ دیانتداری سے اس بات کا اقرار کرے جس میں وُہ ناکام رہا ہے اور صدقِ دل سے اہلِ اسلام سے متعلق اپنے فرض کا اعتراف کرے۔ "لیکن ہمارے پاس یہ خزانہ مٹی کے برتنوں میں رکھا ہے"۔ (۲۔کرنتھیوں ۴ : ۷) خواہ مٹی کے برتنوں میں ہے لیکن خزانہ کے ہم مالک ہیں۔ مسیح جس سے ہم بعض اوقات خدمت کی حالت میں بھی خادموں جیسا برتاؤ نہیں کرتے پھر بھی تمام لوگوں کو پیار کرتا ہے اور یہ مسیح ہی ہے جس کو ہم پیش کر سکتے ہیں۔

دُوسری قابلِ غور بات جس کی صریحاً ہمیں ضرورت ہے وُہ یہ ہے کہ ہم غیر قوموں کے لئے متواضع ہونے کے لئے خُدا سے فضل اور دانائی کے خواہاں رہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ اکثر اوقات سیکھنے اور سکھانے کے بغیر خُدا کی کلیسیا کے مفہوم کو غیر روائتی طور پر ہی سمجھ لیتے ہیں۔ بہت سے ماہرین علم الٰہیات اور کلیسیائی بزرگ گمراہی کی حالت میں حقیقی کلیسیا کی اِدھر اُدھر تلاش کرتے رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جس کلیسیا کی وُہ تلاش میں تھے وُہ یہ خُود ہی تھے، بالآخر کلیسیا کی شناخت کسی بیان یا کلام سے نہیں ہو سکتی۔ حقیقی طور پر کلیسیا کو صرف دیکھ کر ہی شناخت کیا جا سکتا ہے۔ بلاشک یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم بیان کریں کہ مسیحی کیا ہوتے ہیں لیکن ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہم خُود مسیحی ہوں۔ مسیحی رفاقت ایک

متواضع مسیحی جماعت سے بڑھ کر اَور کہیں زیادہ اچھی نہیں دیکھی جاسکتی۔
بہُت سے مسلمان ایسے ہیں جنہوں نے مسیح کو کلیسیائی ممبر اَور گرجے کی بجائے گھر، خاندان، ٹینس کورٹ یا راستہ میں آسانی سے پالیا، لہٰذا یہ نہایت ضرُوری ہے کہ اہلِ اسلام کو بغیر کسی ذہنی تحفظ کے مسیحی کاموں کے عملی حقیقتوں کو دیکھنے کے لئے مدعو کیا جائے یا اُن کو کسی انسانی خدمت یا دیہی رفاع کے باہمی تعاون سے چلنے والی سکیم کو دیکھنے کے لئے بُلایا جائے تاکہ وُہ خُداوند مسیح کی محبّت کے جذبے کو دیکھ سکیں۔ ایسے مقاموں پر وُہ زندگی کے حقیقی معنوں سے آشنا ہوگا اَور خُداوند مسیح کے حقیقی مقصد اَور چیلنج کو بھی معلوم کر سکے گا۔ ابتدائی شاگردوں کی طرح بعض لوگ مسیح کے پاس اس لئے آتے ہیں کیونکہ وُہ ان کو دُوسروں تک لے جاتا ہے اَور پھر لوگوں کی خدمت سے وُہ مسیح کی صلیب کے حقیقی معنی تک پہنچ جاتے ہیں۔ خدمت یقینی طور پر ایمان کے پیچھے پیچھے چلتی ہے لیکن جب ایمان سے رُوح جنتی ہے اس ایمان کو دُوسروں کی رُوحوں کو بچانے والا ارادہ بھی ضرُور پیدا کرنا چاہیئے۔
عمل اَور عملی تفسیر ہی آخری برکت ہے لہٰذا ہمیں اپنے گھر، اپنے پیشے اپنے دفاتر، اپنے تفریح و طبع کے اوقات اَور اپنے دیگر امُور کو ایسا بنانا چاہیئے کہ یہ تمام خُداوند مسیح کی اطاعت کے معیار پر پُورے اُتریں تاکہ جو کچھ خُداوند کے تفضل نے ہمیں بنایا ہے اُس کے ذریعے وُہ اُس کو بھی پہچان سکیں اگرچہ کلیسیا کو اپنے مذہبی تصوّرات، اصُول حیات، اُس کے ماخذ اَور نوعیت کی تفسیر و تشریح کرنا نہایت ضرُوری ہے لیکن اس کے معنی یقیناً اُن مردوں اَور عورتوں کی زندگی میں بھی پائے جائیں گے جن کے دِل فضل کے وسائل کی بدولت اپنے ہمعصروں کے اُمید و بیم اَور حاجتوں کے لئے ایک شخصی تواضع کا کام دیتے ہیں، اب لوگوں کو معلُوم ہوگا کہ یہ لوگ مسیح کے ساتھ رہ چکے ہیں اَور اب اُس کی رفاقت میں ہیں۔

لہٰذا کلیسیا کے حقیقی معنی کا بھید آشکارا ہو جاتا ہے۔ پھر کلیسیا کی بدولت خُدا، الٰہی کتب، صلیب اور مسیح سے متعلق بھیدوں کے بھرپُور معنی بھی کھُل جاتے ہیں جو تاریخ میں اس کی زندگی کی ساخت کا باعث ہیں اور جو آج بھی کلیسیا کو دنیا میں خدمت اور تبلیغ کے لئے بھیجتے رہتے ہیں۔



وطن پرنٹنگ پریس لاہور میں باہتمام مسٹر ڈی ۔ ایس ۔ کے فضل سیکرٹری
پنجاب رلیجس بک سوسائٹی ۔ انارکلی لاہور چھپ کر شائع ہوئی ۔

